

درخت آدمی

افسانے

محمد منشا یاد



شجر بے سایہ

سہ پہر کا وقت تھا جب نمبردار کی بیوی ست بھرائی اسے اپنے ساتھ لے کر اس کے گھر پہنچانے لگی۔

وہ میلے میں لٹ جانے اور خالی ہاتھ واپس آنے والے بچے کی طرح آنکھیں جھکائے کھوئی کھوئی ست بھرائی کے پیچھے چل رہی تھی۔ وہ اسے بار بار تسلیاں دے رہی تھی مگر وہ سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ وہ چہرہ جس پر گلاب مہکتے اور کلیاں چمکتی تھیں ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے چادر سے سارا بدن منہ اور سر لپیٹ رکھا تھا مگر اسے اپنے عریانی کا احساس مارے ڈال رہا تھا۔ عورتیں اور لڑکے بالے اسے یوں رک رک کر دیکھ رہے تھے جیسے وہ مداری کے پیچھے چلتی بندر یا ہو اور ابھی کسی موڑ پر رک کر کرتب دکھانے لگے گی۔

کاش وہ اسے رات کے اندھیرے میں لے کر آتے۔۔۔۔۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ مگر اب سارے فیصلے دوسروں کے ہاتھ میں تھے۔ اپنا فیصلہ غلط ثابت ہو جائے تو آئندہ فیصلوں کا اختیار خود بخود چھن جاتا ہے۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور قدم لڑکھڑا رہے تھے جیسے وہ اپنے گھر نہیں جا رہی پھانسی کے تختے کی طرف بڑھ رہی ہو، نمبردار اور گاؤں کے سرکردہ لوگوں نے اس کی برآمدگی کے وقت یقین دلایا تھا کہ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ لیکن وہ اپنے گھر والوں کو جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ کسی طرح زندہ بچ بھی گئی تو اس کا جینا موت سے بدتر ہوگا، وہ اس کے ہاتھ پاؤں ضرور توڑ دیں گے اور وہ کئی روز تک زخموں سے چور کراہتی رہے گی۔

ست بھرائی اس کے آگے آگے اس کے گھر میں یوں داخل ہوئی جیسے فاتح فوج کا جرنیل دار السلطنت میں داخل ہوتا ہے مگر وہاں کسی نے ان دونوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ماں صحن میں چار پائی پر بیٹھی چاول صاف کر رہی تھی، وہ اسی طرح چپ چاپ چاول صاف کرتی رہی۔ چھوٹا بھائی لکڑیاں چیر رہا تھا وہ بدستور لکڑیاں چیرتا رہا۔ بڑا بھائی صحن کے ایک کونے میں چار پائی کی ادوائن ٹھیک کر رہا تھا، وہ بھی اپنے کام میں لگا رہا۔ صرف بھابی نے اس پر ایک نظر ڈالی مگر ایسی جیسی گھر میں گھس آنے والے پلے پر ڈالتے ہیں۔ البتہ اس نے ست بھرائی کو بیٹھنے کے لئے سرکنڈول سے بنا ہوا مونڈھالا کر دیا۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ ست بھرائی خود ہی باری باری سب کو مشورے دیتی اور نصیحتیں کرتی رہی کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس عمر میں ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے کا درجہ بلند کرتا ہے۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ

وہ سیدھی پسار میں چلی گئی تھی اور دروازے کے ساتھ لگ کر ایسی جگہ بیٹھ گئی تھی جہاں سے سب کی حرکات و سکنات نظر آ سکیں۔ وہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے رہنا چاہتی اسے ڈر تھا کہ لکڑیاں چیرتا ہوا بھائی کلبھاڑا لے کر اس کی طرف بڑھے گا اور اسے سوکھی لکڑی کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

تھوڑی دیر بعد ست بھرائی جانے لگی تو اس کا دل بیٹھنے لگا اسے لگ رہا تھا اس کے جاتے ہی وہ اندر آ جائیں گے اور وہ ان سے اپنی زندگی کی بھیک بھی نہیں مانگ سکے گی۔ کچھ مانگنے اور بخشوانے کے لئے الفاظ ضروری تھے اور اس کے پاس پچھتاوے کے آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر جب ست بھرائی کے جانے کے کافی دیر بعد بھی کسی نے اسے برا بھلا نہ کہا کوئی ڈنڈا چھانٹا لے کر اندر آیا تو اسے ہول سا آنے لگا۔ شاید اس کا جرم ایسا تھا کہ کسی چھوٹی موٹی سزا سے اس کی تلافی ممکن نہ تھی۔

شام ہونے کو تھی وریا موکلبھاڑا ایک طرف پھینک کر دودھ دوہنے چلا گیا۔ بڑا بھائی گا موحقہ تازہ کرنے لگا۔ بھابی ننھی صفری کو گود میں لے کر چولہے کے پاس بیٹھ کر چاول پکانے لگی اور ماں رسی پر دھو کر لٹکائے ہوئے کپڑے جمع کرنے لگی۔ کپڑے جمع کر کے وہ اندر آئی اور اس کے قریب سے یوں گزر گئی جیسے وہ اسے دکھائی نہ دے رہی ہو۔ ماں نے کھونٹی سے لائین اتاری اور اسے جلا کر دروازے کی چوکھٹ سے لٹکا دیا۔ اسے لائین کی روشنی بری لگی جیسے اس نے اسے اور زیادہ عریاں کر دیا ہو۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ مکھی بن کر کسی ٹرنک کے پیچھے جا چھپتی، چوٹی بن کر کسی سوراخ میں گھس جاتی۔

چھوٹا بھائی دودھ کا برتن سر پر اٹھائے آپہنچا تو دونوں بھائی چولہے کے پاس بیٹھ کر کنالیوں میں چاول کھانے لگے۔ ماں ننھی صفری کو ٹبل ٹبل کر اور تھپک تھپک کر بہلانے لگی۔

اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کھانے پینے کا اسے ہوش ہی کب تھا۔ ست بھرائی نے اسے اپنے گھر میں روٹی دی تھی مگر نوالہ اس کے حلق سے نہ اترتا تھا۔ وہ خالی پیٹ اتنی دور سے چل کر آئی تھی مگر اب بھی اسے کھانے کی خواہش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی اگر کھانا کھاتے ہوئے بھائیوں میں سے کوئی اس کے بارے میں پوچھ لیتا کہ اس نے کچھ کھایا یا پیا ہے یا نہیں تو وہ بغیر کھائے پئے جی اٹھتی۔ مگر انہوں نے تو شاید ہمیشہ کے لئے اسے کنبے سے خارج کر دیا تھا۔ مگر بھابی کو بالآخر اس کا خیال آ ہی گیا اس نے تھالی میں چاول ڈالے اور اندر آ کر تھالی اس کے اگر سر کا دی اور کچھ کہے سے بغیر لوٹ گئی۔ اسے لگا جیسے وہ سچ سچ ایک پالتو کتیا ہو جسے رات ب ڈالا گیا ہو۔ وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی تھی اس نے بہت کوشش کی مگر اس سے سسکیاں روکی نہ جاسکیں اس کی سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز سن کر بھی کسی کا نوالہ رکنا نہ ہی کسی نے اس کا برا منایا۔ وہ رو دھو کر خود ہی چپ ہو گئی۔ اس نے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے چند ایک

لقتے بھی زہر مار کئے۔ اسے پیاس لگ رہی تھی۔ بھابی پانی دے کر نہیں گئی تھی اور اسے باہر جا کر نلکے یا گھڑے سے پانی لینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

باہر کا دروازہ عموماً کھلا رہتا تھا مگر آج اسے بند کر دیا گیا تھا۔ بند دروازہ دیکھ کر اسے اپنا سانس رکتا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہوا کا راستہ روک دیا گیا ہو۔ دو ایک بار کسی نے دستک دی تو اس کی ماں دروازے تک گئی اور باہر بڑبڑاتی ہوئی دروازہ کھولے بغیر واپس آ گئی۔ ضرور گاؤں کی عورتیں آنا چاہتی ہوں گی جن کو برا بھلا کہہ کر ماں نے وہیں سے لوٹا دیا ہوگا۔ اس کے گھر والے پہلے بھی کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے اور اب تو وہ اور بھی پھرے ہوئے تھے۔

کھانا کھا کر دونوں بھائی صحن میں بیٹھ کر کچھ دیر حقہ پیتے رہے وریا مو باڑے میں جا کر سوتا تھا مگر آج وہ گھر پر ہی رہا۔ گامو بھی خلاف معمول جلدی اٹھ کر سونے کے لئے چلا گیا جیسے انہیں جلدی جاگنا اور کسی اہم مہم پر جانا ہو اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔ کچھ دیر بھابی صحن میں برتن بھانڈے جمع اور صاف کرتی رہی پھر ننھی صغریٰ کو لے کر وہ بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماں برآمدے میں بیٹھ کر تازہ پسایا ہوا آنا منگی میں ڈالنے لگی۔ ماں نے کھانا نہیں کھایا تھا اس نے کھانا کیوں نہیں کھایا تھا یہ سوچ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا کہ کہیں گھر میں کچھ ہونے والا تو نہیں تھا۔

لاٹین بجھا کر ماں سپار میں آ کر اپنی چار پائی پر لیٹ گئی تو اس نے کچھ دیر تامل کیا پھر ہمت کر کے اٹھی اور اس کی پابنتی پر بیٹھ گئی وہ اس کے پاؤں پر سر رکھ کر رونا چاہتی تھی مگر ماں نے پاؤں سمیٹ لئے اور کروٹ بدل لی۔ وہ چپ چاپ سانس روکے اسی جگہ بیٹھی رہی۔ ماں جاگ رہی تھی مگر خود کو سو یا ہوا ظاہر کر رہی تھی وہ کئی راتوں کی جاگی اور دن بھر کی تھکی ہوئی تھی اسے پابنتی پر بیٹھے بیٹھے نیند آنے لگی مگر اسے اپنی چار پائی پر اکیلے سونے سے ڈر لگ رہا تھا پتہ نہیں کب چھوٹا یا بڑا یا وہ دونوں بھائی چپکے سے اندر آ جائیں اور اسے ساتھ چلنے کو کہیں وہ چیخنا چاہے گی مگر دونوں اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکے گا۔ پھر پتہ نہیں وہ اسے کہاں لے جائیں۔ کس طرح ہلاک کریں۔ ہو سکتا ہے گلا گھونٹ دیں، چھری یا ٹوکے سے ذبح کر کے زمین میں دبا دیں۔ کنوئیں یا نہر میں دھکا دے دیں۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ اسے لینے آئیں گے تو ماں اسی طرح خاموشی سے خود کو سو یا ہوا ظاہر کرے گی وہ اس کی اتنی بڑی خطا کیسے معاف کر سکتی تھی۔ معاف کرنا یا درگزر کرنا اس گھر کے لوگوں نے سیکھا ہی نہیں تھا اور پھر وہ اپنے بیٹوں سے بہت ڈرتی تھی وہ بگڑ جاتے تھے تو ماں کو بھی لہو لہان اور بے عزت کر دیتے تھے گھر میں صرف ایک بھابی تھی جو اس کی جان بچا سکتی تھی مگر وہ کیوں بچاتی۔ اس نے بھابی کے کپڑے بھائی کا رشتہ ٹھکرا کر اسے ہمیشہ کے لئے اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ ویسے بھی وہ قصے کہانیوں کی روایتی بھابی کی طرح اس سے

”کچھ فائدہ نہیں۔“

”تو کیا سچ مچ ماں؟۔۔۔۔۔“

”ہاں“

”کب؟“

”یہ مجھے پتہ نہیں“

مارے خوف کے اس کا حلق خشک ہو گیا ہاتھ پاؤں کا نپنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

گاؤں سے قصبے کو جانے والی کچی سڑک پر ایک حویلی تھی۔ جسے کتوں والی حویلی کہا جاتا تھا۔ دو خونخوار قسم کے بولھی کتے دن رات حویلی کے ارد گرد گھومتے رہتے تھے۔ ان کے مالکوں کا جب جی چاہتا انہیں باندھ دیتے جب جی چاہتا کھلا چھوڑ دیتے تھے۔ ان کتوں کے ڈر سے لوگوں نے کچی سڑک سے گزرنا چھوڑ دیا تھا اور انہیں قصبے میں آنے جانے کے لئے کھیتوں کے درمیان والی پگڈنڈی کا راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا کوئی اجنبی یا بھولا بھڑکا شخص ادھر آنکلتا تھا تو اسے کتوں کتوں سے جان بچانا مشکل ہو جاتی تھی۔ ان کتوں نے کئی لوگوں کو زخمی کیا اور جھنجھوڑا تھا گاؤں والے احتجاج کر چکے تھے، کئی وفد بھیج چکے تھے مگر ان لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ گاؤں کے لڑکے جو قصبے کے سکول میں پڑھنے جاتے تھے۔ نہایت بچہ بچا کر اور لمبا چکر کاٹ کر وہاں سے گزرتے تھے انہوں نے ان کتوں کے نام بھی گا مو اور دریا مو رکھ دیئے تھے۔

گا مو اور دریا مو کو لوگ نہایت اجڑا اور ظالم سمجھتے تھے جنہوں نے اپنی سگی بہن کو قتل کر کے نہر یادریا میں بہا دیا یا گڑھا کھود کر کسی کھیت میں دبا دیا تھا اور گاؤں والوں سے ہر قسم کا تعلق توڑ کر گاؤں کی سکونت ترک کر کے یہاں سب سے الگ اس حویلی میں رہنے لگے تھے۔

یہ حویلی کسی زمانے میں مویشیوں کا باڑا تھی وہاں ایک کنواں بھی تھا جسے اب پر کر دیا گیا تھا۔ غفوراں کے روپوش یا قتل ہو جانے کے بعد ان لوگوں نے اس میں چند ایک کمروں کا اضافہ کر کے اسے حویلی کی شکل دے دی تھی۔

گاؤں میں اس حویلی کے بارے میں طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ باغ علی حجام کا کہنا تھا کہ ایک دو پہر کو وہ قصبے کی مشین سے آٹا پسوا کر لوٹ رہا تھا کہ حویلی سے کچھ فاصلے پر کسی عورت نے اس کا نام لے کر پکارا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

دو سے جیسے اعتباری آدمی کا بیان تھا کہ اس نے ایک رات کھیتوں کو پانی لگایا ہوا تھا کہ اس نے دیکھا ایک جواں سال عورت بال بکھرائے کھال کے اندر بے آواز چلتی جا رہی تھی اس نے آواز دی تو قہقہہ لگا کر غائب ہو گئی۔ حویلی سے کچھ فاصلے پر ایک بہت اونچا کھجور کا پیڑ تھا بعض لوگوں نے کھجور کے اس پیڑ کے قریب سے بھی عجیب و غریب قسم کی آوازیں سنی تھیں۔ دو میراثی نے تو ایک پچھلی پیری کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی تھا۔

ایک روز چودھری سرور کی بیٹی باپ کا کھانا لے کر کھیتوں میں گئی۔ چودھری سرور آم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا اور وہ قریب بیٹھ کر پنکھا جھل رہی تھی کہ اچانک اسے پتہ نہیں کیا سو جھی وہ دوڑ کر درخت پر چڑھ گئی۔ چودھری سرور نے خفا ہو کر ڈانٹا کہ جواں لڑکیاں درختوں پر نہیں چڑھتیں تو وہ جواب میں قہقہے لگاتی اور اوپر چڑھتی جاتی۔ پھر اس نے آم کی ٹہنی سے چھلانگ لگا دی اور گر کر بے ہوش ہو گئی اب وہ میسا کھیوں کے سہارے چلتی تھی۔

لوگوں نے ایسے واقعات اور قصوں کی کڑیاں حویلی سے ملا دی تھیں اور یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ غفوراں کو نہایت بے دردی سے قتل کر کے حویلی کے پاس کہیں ان کھیتوں میں دفن کر دیا گیا تھا اور اس کی بے چین روح بھوت یا چڑیل کی صورت میں وہاں گھومتی رہتی تھی۔ گاؤں میں صرف ایک مولوی فیروز دین تھے جواں باتوں پر یقین نہیں کرتے تھے اور انہیں ضعیف العقیدہ لوگوں کا واہمہ قرار دیتے تھے لیکن پھر ایک روز ان کے ساتھ نہایت عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ رات کے وقت قصبے سے لوٹ رہے تھے کہ اچانک ان کے آگے آگے ایک دیا روشن ہو گیا۔ کچھ دیر وہ رو بلا کے لئے مخصوص دعائیں اور وظیفے پڑھتے رہے مگر جب جلتا ہوا دیا ان کے بہت قریب آ گیا اور ہوا میں تیرتا ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تو وہ ساری دعائیں بھول گئے اور بے ہوش ہو کر کھڈ میں گر گئے۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ غفوراں کو قتل کر کے نہریادریا میں بہا دیا گیا تھا۔ بعض کا خیال تھا کہ اسے گاؤں والے مکان میں قتل کر کے دفن کر دیا گیا۔ یہ مکان اب تک مقفل تھا۔ وہ اسے فروخت کرتے تھے نہ اس کی دیکھ بھال اور مرمت پر توجہ دیتے تھے۔ مگر ساتھ والے گاؤں کے مستری ظہور نے جو حویلی کی تعمیر اور مرمت کا کام کرتا رہا تھا لوگوں کو بتایا تھا کہ حویلی کے اندر گامو اور دریا مو کے گھروں کے عین درمیان ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا جس پر سرکنڈوں اور سوکھی ہوئی لکڑیوں کا ڈھیر پڑا رہتا تھا اور جسے گھر کے لوگ ضرورت کے وقت بھی نہیں جلاتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ چبوترہ دراصل ایک قبر تھی اور اسی کی نگرانی کی خاطر ہی وہ لوگ گاؤں والا مکان چھوڑ کر وہاں منتقل ہوئے تھے۔

گاؤں کی عورتیں سکینہ کو بھی چڑیل کے نام سے ہی یاد کرتی تھیں جو اپنی بیٹی کی حفاظت نہ کر سکی تھی اور ماں ہو کر اسے بدسلوکی سے

تنگ آکر بھاگ جانے پر مجبور کر دیا تھا پھر اس کے عیبوں پر پردہ ڈالنے کی بجائے قتل ہو جانے دیا تھا۔ وہ گاؤں میں بہت کم آتی تھی مگر جب بھی آتی جدھر سے گزرتی، سہاگنیں، حاملہ عورتیں اور نوجوان لڑکیاں اس کے سائے سے بچنے کے لئے راستہ بدل لیتیں۔ ان کا خیال تھا وہ جسے چھو لے گی یا جس سے بات کرے گی اس کی کوکھ کبھی ہری نہ ہوگی یا گود خالی ہو جائے گی۔ اس کے بارے میں مشہور ہو گیا تھا کہ وہ جس درخت کے نیچے بیٹھ جاتی تھی وہ بے سایہ ہو جاتا تھا۔ گاؤں میں جب بھی کوئی غیر معمولی واقعہ یا حادثہ رونما ہوتا بوڑھی سکینہ اور اس کے خاندان کو اس میں ضرور ملوث کر لیا جاتا۔ بڑی بوڑھیوں نے تو گامو کے ہاں نرینہ اولاد نہ ہونے کو بھی غفوراں کی روح کا انتقام ہی سمجھا تھا اور جب وریامو کا نو عمر بیٹا سانپ کے ڈسنے سے مر گیا تو اسے بھی اسی انتقامی کارروائی کا حصہ سمجھا گیا جو غفوراں اپنے گھر والوں سے لے رہی تھی۔

سکینہ نے بھی کبھی اپنی صفائی میں کچھ کہنا ضروری نہ سمجھا تھا۔ شروع میں جب لوگ استفسار کرتے تھے تو وہ نہایت مختصر سا جواب دے کر آگے بڑھ جاتی تھی۔

”چلی گئی۔۔۔۔۔ کرماں ماری آئی تھی۔“

بعض لوگوں نے اس سے یہ مطلب نکالا تھا کہ وہ گھر والوں کی بدسلوکی اور خوف کی وجہ سے دوبارہ بھاگ کر موچیوں کے پاس چلی گئی تھی جو اس کے بھائیوں کے خوف سے روپوش ہو گئے تھے مگر بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ بڑھیا نے نہایت پتے کی بات کی تھی انسان مر کر بھی تو ہیں جاتا تھا سے آیا ہوتا ہے۔

گاؤں کے بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ یہ خاندان پرانے زمانے کے کسی ایسے غیر ملکی حملہ آور قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جو جسمانی خوبصورتی میں لاثانی تھا۔ خصوصاً ان کی عورتیں حسن و جمال میں نہایت ممتاز حیثیت کی حامل ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب صفرائی نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس پاس کے دیہات میں اک بار پھر اس خاندان کے حسن کی دھوم مچ گئی۔

اگرچہ صفرائی بہت کم حویلی سے باہر قدم رکھتی ہے مگر اب حویلی کے گرد حصار پہلے جیسا ناقابل عبور نہیں رہا۔ وریامو اور گامو کا ایک دوسرے سے جھگڑا ہو گیا ہے اور وہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور ایک دوسرے سے بات تک کرنے کے روادار نہیں ہیں۔ گامو کو نرینہ اولاد نہ ہونے کے صدمے نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ سکینہ بوڑھی اور کمزور ہو گئی ہے اور اگرچہ وہ وریامو کے پاس رہتی ہے مگر وہ ماں سے زیادہ صفرائی کا خیال رکھتی ہے۔ ان کے بو بھی کتے مر کھپ گئے ہیں۔ ایک بیمار پڑ گیا تھا دوسرے کو کسی نے زہر دے دیا۔ کتے اب بھی حویلی کی رکھوالی کرتے ہیں مگر وہ بھونک کر چپ ہو جانے یا

تھوڑی دور تک پیچھا کر کے ہانپ جانے والے عام سے کتے ہیں۔ ان لوگوں کے گاؤں والوں سے تعلقات بھی بہتر ہو رہے ہیں اور وہ شادی غمی کے موقعوں پر گاؤں میں آنے جانے لگے ہیں۔ صغریٰ اکیلی کہیں نہیں جاتی مگر ماں یا دادی کے ہمراہ کبھی کبھار گاؤں چلی جاتی ہے۔

پچھلے کچھ عرصہ سے حویلی کے گرد منڈلانے والے نوجوان کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔ رات کو چاروں طرف سے بانسریوں، الغوزوں اور فراقیہ گیتوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ صغریٰ دن کو بار بار چھت پر آنے جانے اور راتوں کو دیر تک جاگنے لگی ہے۔

یہ سرما کی ایک تاریک اور سرد رات کا قصہ ہے جب آدھی رات کے قریب رابعہ نے اپنے شوہر کو سوتے میں جگا کر بتایا کہ صغریٰ حویلی میں نہیں ہے۔

”کہاں گئی“ گا موہڑ بڑا کراٹھ بیٹھا۔

”میری آنکھ کھلی تو وہ اپنے بستر میں نہیں تھی۔ میں نے پہلے تو یہی جانا کہ ادھر ادھر ہوگی ابھی آجائے گی مگر اس کا کچھ پتہ نہیں ہے۔“

”تمہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے تمہیں اس کتیا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

شور سن کر سکینہ بھی جاگ گئی اور لڑکھڑاتی ہوئی آگئی۔

رابعہ نے لائین چلائی۔ گا مو نے نکوا سنبھالا۔ لائین لے کر وہ تینوں کچھ دیر حویلی کے اندر باہر اسے ڈھونڈتے رہے۔ انہوں نے وریا مو کے گھر میں بھی جھانکا مگر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ پھر سکینہ نے مشورہ دیا۔

”تم ترکھانوں کے ہاں جا کر دیکھو ان کا بیٹا فضلوا کثر حویلی کے آس پاس منڈلایا کرتا ہے۔ جلدی کرو۔“

گا مو نکوا لئے اندھیرے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا گاؤں کی طرف چلا گیا۔ تو رابعہ روتے ہوئے اپنی ساس سے لپٹ گئی۔

”اب کیا ہوگا ماسی؟“

”وہی جو اس گھر میں ہوتا چلا آیا ہے۔“

”نہیں ماسی خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ میری ایک ہی بیٹی ہے۔“

”میرے کہنے نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے میری اس گھر میں کون سنتا ہے؟“

”تم اس کے پیچھے جاؤ ماسی۔۔۔۔۔۔ وہ اسے مار ڈالے گا۔“

”نہیں یہ غیرت کا معاملہ ہے وہ میری ایک نہیں سنے گا۔“

ابھی پونہیس پھٹی تھی جب حویلی کے باہر آہٹ سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے دیکھا وہ اسے ساتھ لئے آ پہنچا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا گیا ہے وہ ڈری اور سہمی ہوئی تھی۔ حویلی کا صدر دروازہ بند کر کے گا مو اس کے قریب آیا اور اسے لاتوں اور مکوں سے پیٹنے لگا، وہ زمین پر گر گئی تو وہ دھاڑا۔

”ٹو کا کہاں ہے، میں اس کے نکلے کر دوں گا۔“

”ٹوکا کہاں ہے، میں اس کے ٹکڑے کروں گا۔“

صغریٰ ماں کے پاؤں پڑ گئی۔

”مجھے بیاہو ماں۔۔۔۔۔ ابا مجھے مار ڈالے گا۔“

”ٹوکا تمہارے پاس پڑا ہے گامو“ سکینہ نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

رابعہ نے غصے اور نفرت سے اور صغریٰ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ گاموٹو کا اٹھانے کے لئے مڑا تو رابعہ نے اسے روک دیا اور بولی۔

”ہوش کرو غصے میں تم پاگل ہو جاتے ہو۔“

پھر اس نے ٹوکا پکڑ کر دورانہ ہیرے میں پھینک دیا اور زمین پر گر گئی ہوئی صغریٰ کو سہارا دے کر اندر لے گئی۔

”میں دیکھ رہی ہوں گا مو۔۔۔۔۔“ سکینہ بولی ”یا تو تم بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہو یا بے غیرت۔“

”ماں“ گامونے مرجھائے ہوئے لہجے میں کہا اور نادام سا ہو کر اندر چلا گیا۔

جب وہ اپنے اپنے بستروں میں لیٹ گئے تو انہیں چبوترے کی طرف سے بلند آواز میں بین کرنے کی آواز سنائی دی۔

”کرماں مارے غفور و۔۔۔۔۔۔ اس رات تیرا باپ بھی زندہ ہوتا تو تیری فریاد سن لیتا۔“

پھر اس کے دو ہاتھوں سے چھاتی پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں جیسے غنور اس ابھی ابھی قتل ہوئی ہو۔



سانپ اور صدا

دو آدمیوں کی سیٹ پر وہ اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بال سفید تھے مگر چہرے پر بڑھاپے کے آثار نہیں تھے۔ پہلی نظر میں مجھے وہ ایسا ادکار دکھائی دیا جس نے بڑھاپے کا میک اپ کر رکھا ہو۔

میں نے کھنکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر وہ کلنگی باندھے خالی خالی نظروں سے باہر دیکھتا رہا۔ میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”میں یہاں بیٹھ جاؤں؟“

اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ ایک نظر مجھ پر ڈالی جیسے میں مداخلت بے جا کا مرتکب ہوا ہوں اور پھر کمال بے نیازی سے باہر دیکھنے لگ گیا۔ مجھے برا تو بہت لگا مگر ایسے موقعوں پر خاص طور پر اجنبیوں سے ملتے ہوئے نہایت احتیاط برتا ہوں خدا جانے کون کیسا ہوا اور کیا رویہ اختیار کرے۔ میں بچی کھچی تھوڑی سی جگہ پر ٹنک گیا۔ میرا خیال تھا میرے بیٹھ جانے کے بعد وہ تھوڑا بہت کھڑکی کی طرف سرک جائے گا مگر وہ پتھر کی طرح اسی جگہ پر جما باہر دیکھتا رہا۔ مگر پھر تھوڑی دیر بعد اچانک چونک پڑا جیسے سوتے میں ہڑبڑا کر جاگا ہو اس نے آس پاس کا جائزہ لیا پھر مجھے تکلیف میں بیٹھے دیکھ کر کھڑکی کی جانب ہو گیا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔

خاموشی بذات خود پراسرار ہوتی ہے۔ مجھے وہ عجیب اور پراسرار سا دکھائی دیا۔ لگتا تھا لوگوں کے ہجوم میں بھی وہ اپنے آپ میں گھرا بیٹھا ہے مگر تھوڑی دیر بعد جب ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی اور اس نے اپنے لئے نان کباب منگائے تو باری باری مجھے اور سامنے کی سیٹ پر بیٹھے مسافروں کو کھانے میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اور جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے سب نے شکریے کے ساتھ معذرت کر لی مگر جب اس نے تھیلے میں سے گھر کی بنی ہوئی مٹھائی نکال کر سب کو پیش کی تو اس کے اصرار کو دیکھ کر سامنے کی سیٹ پر بیٹھے نوجوان کے سوا کسی کو انکار کی ہمت نہ ہوئی۔

”میں اپنی بہن کے پاس گیا ہوا تھا۔“ اس نے بچا کھچا کھانا کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے اور زبان سے انگلیاں چاٹتے ہوئے ہوئے کہا ”آتے ہوئے اس نے زبردستی یہ مٹھائی میرے تھیلے ڈال دی۔“

”بہنوں کو بھائیوں کا بہت خیال ہوتا ہے۔“ سامنے کی سیٹ پر کھڑکی کے قریب بیٹھے ادھیڑ عمر کے آدمی نے جواب دیا۔

گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو پھیلتا چلا گیا اور مجھے یہ جان کر اطمینان ہو کہ وہ ملنسار اور خوش گفتار آدمی تھا۔ ذرا بے تکلفی ہوئی تو میں نے پوچھا۔

”جب میں نے سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت مانگی تو آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔“

”کب؟“ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔۔۔۔۔ پھر کچھ سوچ کر خود ہی بولا ”میں وظیفہ پڑھ رہا تھا دھیان نہ دے سکا“ معافی چاہتا ہوں۔“

وظیفے کے بارے میں مجھے کچھ پوچھنا ٹھیک معلوم نہ ہوا میں نے کہا ”چلئے کوئی بات نہیں۔“

تھوڑی دیر بعد چلتی گاڑی میں مانگنے والا فقیر آ گیا۔ صبح سے ڈبے میں کئی طرح کے مانگنے والے آچکے تھے مگر یہ فقیر دوسروں سے قدرے مختلف معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر حاجت کے بجائے عجیب طرح کا اطمینان اور لہجے میں بلا کا اعتماد تھا جیسے مانگنے کے لئے نہیں خود غریبوں میں زکوٰۃ تقسیم کرنے آیا ہو۔

”ایک دس روپے کا سوال ہے مومنو“

ڈبے کے سارے مومنین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”پورے ڈبے سے ایک ہی سوال ہے بابا۔۔۔۔۔ صرف دس روپے۔۔۔۔۔ ہے کوئی سخی مومن جو میری حاجت پوری کرے۔“

مسافر جھنجھلائے ہڑبڑائے اور اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر مانگنے والے کو شاید اپنا مطالبہ پورا ہونے کا پختہ یقین تھا وہ ڈبے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک برابر چکر اور صدا لگاتا رہا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا میں نے اسے ایک روپے کا نوٹ تھمانے کی کوشش کی مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے شرمندہ ہو کر نوٹ دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔

”مہنگائی کے ساتھ بھیک کے نرخ بھی بڑھ گئے ہیں۔“ نو جوان نے ہنستے ہوئے کہا ”نرخ ہی نہیں نرخہ بھی بڑھ گیا ہے۔“ میں نے غصے سے کہا ”کون دے گا اس دس روپے؟“

”دیں گے سب دیں گے۔“ وہ بولا ”ابھی تم لوگ دیکھ لو گے۔“

اور سچ مچ ایسا ہی ہوا جیسا اس نے کہا تھا تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ لوگوں نے آپس میں چندہ کر کے اس کے لئے پیسے جمع کرنا شروع کر دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مطلوبہ رقم جمع ہو گئی۔ مجھے بھی بادل خواستہ دوبارہ جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکال کر دینا پڑا۔

”آپ تو کہہ رہے تھے کون دے گا دس روپے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”ہاں کمال ہو گیا۔“ میں نے جواب دیا ”بڑے چالاک ہوتے ہیں یہ مانگنے والے۔“

”ان کا روز کا تجربہ ہوتا ہے۔“ نو جوان نے کہا ”شکر کیجئے اس نے دس روپے ہی مانگے اگر سو پچاس مانگ لیتا تو آپ کو زیادہ

پیسے دینا پڑتے۔“

”میں تو کبھی نہ دیتا“ میں نے کہا۔

”آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہیں۔“ میں نے نو جوان سے پوچھا۔

”اس لئے کہ میں جانتا ہوں ہمارے زیادہ تر لوگ سیدھے سادے اور دل کے سچے سچے اور مومن ہوتے ہیں جب ان سے اس

قسم کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ مانگنے والے کو واقعی اتنی ہی رقم کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت پوری کرنا ان کا فرض

ہے۔“

اس نے چونک کر نو جوان کی طرف دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے بعض لوگ فطرتاً نیک دل ہوتے

ہیں۔ نیک اور معصوم۔ ان کا دل خوبصورت ہوتا ہے ان سے کوئی قیمتی چیز بھی مانگ لی جائے تو انکار نہیں کر سکتے۔“

وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔۔۔۔۔ پھر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اداس لہجے میں بولا ”اور بعض مانگنے والے ایسے ظالم اور

ڈھیٹ ہوتے ہیں کہ جان مانگ لیں تو بھی لے کر ہی ٹلتے ہیں۔“

”تو کیا فقیر جان بھی مانگ لیتے ہیں؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”ہاں“

”کیا ایسا کبھی ہوا ہے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“ وہ بولا ”مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔“

”اچھا؟“ ادھیڑ عمر والے نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”ابھی تھوڑی دیر بعد ہم اس گاؤں کے قریب سے گزریں گے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔“

”کیا ہوا تھا؟“ ہم ہمہ تن گوش ہو گئے۔

”اس گاؤں میں صدالگانے والا ایک فقیر آیا۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ فصل پکنے پر فقیر ہی کیا۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کون کون لوگ

کہاں کہاں سے آ جاتے ہیں۔ بھانڈے، میراثی، مداری، سپیرے، ہاشے، بازگیر، سنت، سادھو، پیر، کچھ اور بندر نچانے والے اور گانے والی خانہ بدوش عورتیں۔“

”ہاں یہ تو ہر جگہ ہوتا ہے۔“ ادھیڑ عمر والے نے کہا۔

”صدالگانے والے فقیر بھی آتے ہیں۔۔۔۔۔۔“ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”جو چند ہفتے یا مہینہ دو مہینہ صرف صدالگاتے رہتے ہیں کچھ لیتے نہیں ہیں پھر جب گاؤں کے لوگ ذہنی طور پر تیار ہو جاتے ہیں تو وہ اپنا کوئی بڑا سا مطالبہ پیش کر دیتے ہیں لیکن وہ فقیر جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں بہت مختلف نکلا۔“

”کیسے؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”شکل و صورت اور لباس سے تو وہ عام فقیروں جیسا ہی تھا۔ سر اور داڑھی کے بال بڑھائے۔ سبز رنگ کا لمبا سا چونہ پہنے گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالائیں اور ہاتھوں میں کچ کے کنگن، انگوٹھیاں۔ صدابھی اسی طرح لگاتا جیسے عام مانگنے والے لگاتے ہیں مگر اس کا صدالگانے کا وقت عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوتا اور رات بھر جاری رہتا۔ وہ اللہ ہو کا ورد کرتا ہوا گلی گلی گھومتا ہر گھر کے سامنے لمحہ بھر کے لئے رکتا اور رات بھر گاؤں کے چکر لگا کر فجر کی اذان سے پہلے پہلے کہیں غائب ہو جاتا۔“

”کہاں غائب ہو جاتا؟“ ادھیڑ عمر والے آدمی نے پوچھا۔

”اسے کسی دوسرے گاؤں میں بھی صدالگانے جانا ہوتا ہوگا۔“ میں نے اپنی رائے دی۔

”نہیں“ وہ بولا ”بعد میں لوگوں نے اس بات کا کھوج لگانے کی کوشش کی مگر اس کی تصدیق نہ ہو سکی۔ وہ کسی اور گاؤں میں صدال نہیں لگاتا تھا۔“

”اچھا تو پھر کیا ہوا؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”لوگوں کا خیال تھا کہ مہینہ دو مہینے یہ سلسلہ چلے گا پھر وہ اپنا مطالبہ پیش کر دے گا مگر جب سلسلہ تین چار مہینوں پر پھیل گیا تو لوگوں کو تشویش ہونے لگی۔“

”تشویش کی اس میں کیا بات تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”تھی۔۔۔۔۔۔“ وہ بولا ”ایک تو لوگوں کو اس پر ترس آتا تھا دوسرے صدالگانے کا عرصہ جتنا طویل ہو رہا تھا اس کا مطالبہ بھی اتنا ہی بڑا ہو سکتا تھا۔ اس چار ماہ کے عرصہ میں فصل پکی، کٹی اور کھیتوں کھلیاں ان سے اٹھ کر بھڑولوں، منکوں اور منڈیوں میں پہنچ گئی مگر اس

نے کسی سے کچھ نہ مانگا نہ قبول کیا۔ اس عرصے میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ عشاء کی نماز کے بعد کبھی گلیوں میں اس کی اللہ ہو کا ورد سنائی نہ دیا ہو۔ آندھی چل رہی ہوتی یا موسلا دھار بارش ہو رہی ہوتی وہ سردی گرمی اور اندھیرے اجالے سے بے نیاز مسلسل صدا لگا تا گزرجاتا۔ لوگوں نے اس کا ٹھکانہ معلوم کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ وہ گھنی جھاڑیوں اور درختوں سے گھرے قبرستان کی طرف سے آتا اور ادھر جا کر کہیں روپوش ہو جاتا تھا۔ کبھی کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ ہر بات کا جواب اللہ ہو سے دیتا۔۔۔۔۔ رفتہ رفتہ اس کی صدا معمول کا حصہ بن گئی۔“

”یہی تو ایسے لوگوں کا مقصد ہوتا ہے۔ نوجوان نے کہا ”کہ لوگ اس کے اتنے عادی ہو جائیں کہ اگر کبھی معمول میں خلل پڑے تو انہیں تشویش ہونے لگے۔“ ”شاید تم ٹھیک کہتے ہو“ وہ بولا ”لوگ اس کی صدا کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ سونے سے پہلے اس کے منتظر رہنے لگے۔ اگر کبھی ذرا دیر ہو جاتی تو انہیں نیند نہ آتی۔ عجیب خالی پن کا احساس ہوتا۔ گاؤں کے لوگ اپنے تئیں قیاس کے گھوڑے دوڑاتے۔ کسی کا خیال تھا وہ لیاری گائے یا بھینس کا مطالبہ کرے گا، کسی کا گویڑ (اندازہ) تھا کہ اس کی بیٹی کی شادی ہوگی جس کا خرچہ وہ گاؤں والوں سے وصول کرنا چاہتا تھا۔ بعض لوگ یہ سوچ کر پریشان ہوتے کہ اگر اس نے کوئی بڑا مطالبہ کیا جسے گاؤں والے پورا نہ کر سکے تو کیا ہوگا۔ ممکن ہے اس کی بددعا سے گاؤں میں کوئی وبا پھوٹ پڑے آدمی اور مویشی مرنے لگیں۔ کھلیانوں میں خود بخود آگ بھڑکنے لگے یا چوریوں، ڈاکے اور قتل و غارت میں اضافہ ہو جائے مگر بڑے بوڑھے اطمینان دلاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ اس کا مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو وہ دوبارہ صدا لگانا شروع کر دے گا اور اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رکھے گا جب تک گاؤں والے عاجز آ کر اس کا مطالبہ پورا نہ کر دیں۔ اس سے لوگوں کی ڈھارس بندھی۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اللہ کے نیک بندے کسی کا برا نہیں چاہتے۔ بددعا نہیں دیتے۔“ ادھیڑ عمر والے مسافر نے کہا۔

”اچھا تو پھر اس نے کیا کچھ مانگا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی تو پریشانی کی بات تھی۔“ وہ بولا ”چھ مہینے گزر گئے۔ دو فصلیں اٹھ گئیں مگر اس نے کوئی مطالبہ نہ کیا اور نہ ہی اپنے معمول میں فرق آنے دیا۔ لوگوں کی تشویش اور الجھن میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ بعض لوگ اعصابی تناؤ اور ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گئے۔۔۔۔۔ مگر پھر وہ ایک روز غائب ہو گیا۔“

”غائب ہو گیا؟“ نوجوان نے حیرت سے پوچھا۔ ”خالی ہاتھ؟“

”ہاں“

”ہاں۔۔۔۔۔ اور ڈوب گئی۔“

”اسے بیماری کیا تھی؟“

”کہتے تھے اسے نیند بہت آتی تھی۔ اس پر دن بھر غنودگی چھائی رہتی جب دیکھو اونگھتی نظر آتی۔ پہلے پہلے سب کو شک تھا کہ نشہ کرتی یا سانپ سے ڈسوائی ہے پھر اس کی کڑی نگرانی کی جانے لگی مگر کچھ فرق نہ پڑا۔ وہ بیٹھے بیٹھے بات کرتے کرتے اور کھانا کھاتے کھاتے سو جاتی۔ پھر بھی ہر وقت نیند سے اس کا بدن ٹوٹتا رہتا اور وہ جما ہیاں لیتی رہتی جیسے رات بھر جاگتی رہی ہو۔“ وہ لمحہ بھر کو رکا پھر آنکھ میں پڑا اگر دو غبار صاف کرتے ہوئے بولا ”جب یہ کیفیت مسلسل کئی ماہ تک جاری رہی تو اس کے سرال والے تنگ پڑ گئے۔ وہ خود بھی تنگ پڑ گئی ہوگی جیسی تو ایسی گہری نیند سو گئی کہ پھر کوئی جگانہ سکے۔“

”اور وہ فقیر؟“ نو جوان نے پوچھا۔

”جس روز یہ واقعہ پیش آیا۔ اس رات آخری بار اس کی صدا سنائی دی اس لئے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ گاؤں سے ایک جان کا نذرانہ چاہتا تھا وہ پورا ہو گیا تو چلا گیا۔“

”عجیب قسم کا فقیر تھا۔“ ادھیڑ عمر کے مسافر نے کہا۔

”ہاں بہت ہی عجیب اور سنگدل۔۔۔۔۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ بعض فقیر ایسے ظالم اور ڈھیٹ ہوتے ہیں کہ جان مانگ لیں تو بھی لے کر ہی ملتے ہیں۔ مانگتے وقت یہ بھی نہیں دیکھتے کہ جس سے جو کچھ مانگ رہے ہیں وہ اس کے بس میں بھی ہے یا نہیں۔“ بولتے بولتے وہ اچانک چپ ہو گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر جب گاڑی کسی پل پر سے گزر رہی تھی تو وہ بولا ”یہ ہے وہ نہر جس میں جیراں نے چھلانگ لگائی تھی۔“

ہم سب نے گردنیں اٹھا کر اور نیم استادہ ہو یوں باہر دیکھا جیسے وہ نہر میں اب تک ڈبکیاں کھا رہی ہو اور ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔ نہر پلک جھپکنے میں گزر گئی۔ میرے دل میں کئی طرح کے سوالات پیدا ہو رہے تھے۔ مجھے وہ پھر سے پر اسرار لگنے لگا تھا۔ میں اس کے اپنے بارے میں بھی کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ اب پھر گرد و پیش سے کٹ کر اپنے آپ میں گھر گیا تھا اور شاید دل ہی دل میں کوئی دعا یا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔



پولی تھیں

جب سے میرے ننھیالی گاؤں کے قریب آثار قدیمہ والوں نے ایک قدیم بستی دریافت کی تھی اور اخباروں میں اس کے بارے میں خبریں چھپنا شروع ہوئی تھیں، میں پہلی بار یہاں آیا تھا۔

یوں اس کے بارے میں ماموں جان سے خط و کتابت تھی۔ اور انہوں نے مجھے خطوط کے ذریعے کھدائی میں دستیاب ہونے والے کھنڈروں، برتنوں، پتھروں، اوزاروں، ہتھیاروں، زیوروں، ڈھانچوں، کھوپڑیوں اور دوسری چیزوں کے بارے میں بہت سی دلچسپ معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ مگر اب میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہی دشوار گزار بھوتوں کے مسکن ٹیلے جہاں سے لوگوں کو طرح طرح کی آوازیں اور چیخیں سنائی دیا کرتی تھیں اور جو بال جان معلوم ہوتے تھے۔ اب گاؤں کے بہت سے لوگوں کی روزی کا وسیلہ بن گئے تھے۔ ایک معمولی اور گمنام گاؤں ایک اہم قصبے کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ پکی سڑک سے گاؤں آنے والا کچا راستہ جس پر ذرا سی بارش کے بعد چلنا دشوار ہو جاتا تھا، پختہ سڑک میں تبدیل ہو رہا تھا۔ سرکاری مکانات کھدائی اور سڑک کی تعمیر کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں کو گھر بیٹھے روزگار مل گیا تھا۔

گاؤں کی دکانوں پر شہروں اور قصبوں کی طرح روزمرہ ضرورت کی ہر چیز دستیاب تھی۔ اچھی برانڈ کے سگریٹ عمدہ کوالٹی کی چائے کی پتی اور خالص بنا سیتی کے بند ڈبے چائے اور شربت کے کئی ایک ہوٹل اور کھوکھے چل چکے تھے۔ باغ علی عرف بگو ماچھی کی ماں نے گاؤں والا قدیمی تنور چھوڑ کر ٹیلوں کے قریب جہاں کھدائی ہو رہی تھی نیا تنور لگایا تھا۔ بغل میں رچھائی لئے ہاڑی سونی کے کارے پر خود کھیتوں اور گھروں میں جا کر جاتیں بنانے والے عبداللہ نائی نے گاؤں سے باہر دکان کھول لی تھی اور ٹھنڈے پانی اور کھر درے ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر داڑھی مونڈنے کی بجائے اب وہ شیونگ سنک اور کریم استعمال کرنے لگا تھا بلکہ شیو کرنے کے بعد پاؤں بھی لگاتا تھا۔

گاؤں میں اور بھی بہت سے تبدیلیاں آچکی تھیں مگر گلیاں اور نالیاں ابھی تک ناپختہ تھیں اور کیچڑ اور گوبر سے لت پت نظر آتی تھیں۔ سانسویں کی ٹھنڈی ہوا کے قریب ایک نالی اتنی پھیل گئی تھی کہ مجھے کاروہیں روکنا پڑ گئی تھی۔

پہلے روز میں ٹیلوں کی سیر کرتا اور کھدائی کا کام دیکھتا رہا۔ اگرچہ پرانی بستی کے بارے میں ماموں جان کی خطوط میں لکھی گئی

بعض قیاس آرائیاں ابھی تحقیق طلب تھیں۔ مگر زیادہ تر باتیں حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی تھیں۔ ان کھنڈرات اور ان میں سے برآمد ہونے والی اشیاء کی مونہجوڈارو اور ہڑپہ سے ملنے والی چیزوں سے گہری مماثلت تھی۔ انہی کی طرح کے ہوادارو پختہ مکانات جن میں غسل خانے موجود تھے، گلیاں سیدھی اور نالیاں پختہ تھیں۔ روزمرہ ضرورت کی چیزوں اور زرعی آلات میں بھی مشابہت تھی۔ ایک قلعہ نما حویلی کی کھنڈرات میں اس علاقے میں مرکزی حیثیت رکھتی ہوگی۔ آثار سے پتہ چل رہا تھا کہ اگرچہ ان لوگوں کا بنیادی پیشہ کھیتی باڑی اور مویشی پالنا تھا مگر وہ بہت سے دوسرے پیشے اور ہنر جانتے تھے۔ وہ فنون لطیفہ سے بھی واقف تھے۔ خصوصاً رقص، موسیقی، مجسمہ سازی، ظروف سازی، شاعری اور تحریر و تعمیر سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

میں نے محکمہ آثار قدیمہ کے کارندوں سے ملاقات کی۔ انھرو پالوجی کے ایک ماہر سے بھی تبادلہ خیالات کیا جس سے اندازہ ہوا کہ اس بستی کے لوگ خوشحالی اور امن و چین کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ اپنے عہد کے اعتبار سے خاصی ترقی یافتہ تہذیب اور ثقافت کے وارث تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ لوگ یونہی امن و چین اور خوشحالی کی زندگی گزارتے رہتے تو اپنے لوگوں کو علم اور تہذیب و تمدن کی ترقی سے کبھی محروم نہ رکھتے۔ مگر پھر شاید غیر ملکی حملہ آوروں نے یلغار کر دی اور سب کچھ تہس نہس ہو گیا۔ ان حملہ آور اجڈ اور وحشی قبائل نے گھروں کو جلا ڈالا اور بستی کو مسمار کر دیا فصلیں اجاڑ ڈالیں۔ اور لوگوں سے مویشی، اناج، زیورات اور عورتیں چھین لیں۔ مردوں کو تہ تیغ کر دیا یا انہیں غلام بنالیا۔ بعض جنہوں نے اطاعت قبول نہ کی جنگلوں بیلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور جب تک بن پڑا ان لٹیروں سے اپنی زمینیں اور عورتیں واپس لینے کے لئے برسہا برس پیکار رہے جنہوں نے اصل باشندوں کو بے دخل کرنے کے بعد مسمار شدہ بستی کے قریب ہی نئے گاؤں تعمیر کر لئے تھے اور وہاں مستقل طور پر قابض اور آباد ہو گئے تھے۔ بے دخل کئے جانے والے بستی کے اصل باشندے آہستہ آہستہ بھوک پیاری اور کسمپرسی کا شکار ہو کر کمزور پڑتے گئے۔ پھر انہوں نے نئی بستیوں کے قریب تالابوں کے کنارے ٹھٹھیوں اور جھگیوں میں رہنا شروع کر دیا اور چوہڑے، چمار، گھڑے اور سانسی کہلانے لگے۔ اور آہستہ آہستہ بھول گئے کہ کبھی وہ ان زمینوں اور بستیوں کے اصل وارث تھے۔

میرے لئے یہ سب باتیں نئی اور انوکھی تو نہ تھیں میں قدیم تہذیبوں کے بارے میں پڑھتا سنتا رہا تھا لیکن پھر بھی کسی مٹی ہوئی تہذیب کو اتنے قریب سے دیکھنے کا میرا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اور کتنی حیرت کی بات تھی کہ ایک بستی جو کھنڈر ہو گئی تھی ایک تہذیب جو مر گئی تھی وہ آثار کے ذریعے صدیوں بعد دوبارہ زندہ ہو گئی تھی مگر اس تہذیب کے وارث جو نامساعد حالات میں بھی ہزاروں برسوں سے زندگی گزارتے چلے آئے تھے یہاں تک آتے آتے اصل میں کھنڈر ہو چکے تھے دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی مگر وہ اپنی زندگی اب

بھی صدیوں پہلے کی طرح بلکہ اس سے بھی بدتر طریقے سے گزارنے پر مجبور تھے۔

شام کو میں گاڑی کا تیل پانی چیک کرنے گیا تو سانیوں کی ٹھنڈی کا چکر لگا آیا۔۔۔۔۔۔ وہ بالکل مویشیوں کی طرح رہتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بستی کے اجڑنے کے بعد وہ ابھی ابھی لٹ پٹ کر یہاں آئے ہوں اور ان کا یہاں مستقل یا زیادہ دیر تک رہنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

رات کو ماموں جان کی بیٹھک میں محفل جمی۔ گاؤں کے کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ بڑی دیر تک گپ شپ چلتی رہی۔ گفتگو کا زیادہ تر حصہ سانیوں اور گلگڑوں کی حالت، جرائم کی طرف ان کے رجحان، ان کی محرومیوں اور ان کے ماضی اور مستقبل کے متعلق تھا۔ اور ہر شخص ان سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا۔ مگر ایک بات کی کسی کو سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ خود کو کس کے ساتھ منسوب کرے فاتحین کے ساتھ جو غاصب اور لٹیرے تھے یا مفتوحین کے ساتھ جو مردار اور کھاتے گندی جگہوں پر رہتے اور گندے مندرے کام کرتے تھے۔ اس سے اگلے روز کا واقعہ ہے۔

ہم سب گھر والے برآمدے میں بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے کہ باہر کا دروازہ نیم واپا کر ایک پلا اندر گھس آیا۔ ماموں جان کی عادت ہے کہ وہ کھانا کھاتے ہوئے ہڈیاں پلیٹ میں نہیں رکھتے زمین پر پھیکنے جاتے ہیں۔ ممانی جان ان کی اس عادت سے بڑی تنگ ہیں۔ ہڈی فرش پر پڑی ہو تو بلیوں اور کتوں کو کوئی کہاں تک روک سکتا ہے۔ انہوں نے بڑے لڑکے احمد سے کہا کہ وہ پلے کو باہر نکال کر دروازہ بند کر آئے۔ وہ کابلی کا مارا ہوا ابھی اٹھنے کے لئے پر تول ہی رہا تھا کہ ایک کالا بھنگ بڑا سا لڑکا جس کی شکل و صورت عجیب سی تھی دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر ہمیں کھاتے پیتے دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا اندر آ گیا۔ ممانی جان نے منع کر دیا۔ پھر انہوں نے روٹی پر تھوڑا سا سالن رکھ کر ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے روٹی ان کے ہاتھ سے جھپٹ لی اور وہیں کھڑے کھڑے چٹ کر گیا۔ اس کے کھانے کا انداز عجیب سا تھا۔ کیا کہوں کیسا تھا بس یوں سمجھ لیجئے کہ کھاتے ہوئے وہ آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

”یہ کالو ہے۔“ ماموں جان نے جواب دیا۔ ”سانیوں کا لڑکا ہے بے چارہ بے عقل اور بے زبان ہے۔“

”سن بھی نہیں سکتا۔“ چھوٹے لڑکے ککونے بتایا۔

”صرف ڈنڈے کی زبان سمجھتا ہے۔“ شمیمہ بولی۔

میں حیرت اور افسوس سے کالو کی طرف دیکھ رہا تھا۔

شمینہ کہنے لگی ”بھاء جی۔۔۔۔۔۔ یہ بھی کھدائی میں نکلا ہے۔ اب اسے عجائب گھر میں رکھا جائے گا۔“ اس پر سب ہنسنے لگے۔

پھر ماموں جان نے ایک عجیب بات بتائی کہنے لگے۔

”جس طرح بعض بچوں کو مٹی، گاجنی یا کوئلے کھانے کی لت پڑ جاتی ہے اس طرح کالو کو مومی کاغذ کھانے کا چسکہ ہے۔ وہ ہر

وقت یہ کاغذ تلاش کرتا پھرتا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ مومی کاغذ سے ان کی مراد پولی تھین تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ عادت اسے کب اور کیسے پڑی؟“

”ہمیں اس کا علم نہیں۔“ ماموں جان کہنے لگے ”اس کی ماں کو معلوم ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ بچپن میں اس کے منہ میں چوسنی کی جگہ

مومی کاغذ کا ٹکڑا ڈال دیتی ہوتا کہ وہ ایسے چبانے میں لگا رہے اور وہ کام کاج کرتی رہے۔ یا شاید اس نے شروع میں ایسے کاغذ کھائے

ہوں جن کے ساتھ کوئی میٹھی یا نمکین چیز لگی ہوتی ہو۔ اب بچاری اس کی ماں سارا دن دکانوں، گلیوں اور اردوڑیوں سے مومی کاغذ جمع

کرتی رہتی ہے۔“

میں نے حیران ہو کر پوچھا ”کیا اس کے کھانے کے لئے؟“

”نہیں“ وہ کہنے لگے وہ یہ کاغذ جمع کر کے جلا دیتی ہے تاکہ کالو کے ہاتھ نہ لگیں اور وہ انہیں کھانہ سکے۔ بستی کی دریافت سے

بچاری کا کام بڑھ گیا ہے۔ شہر سے آنے والوں کے ساتھ مومی کاغذ کے لفافے کثرت سے آنے لگے ہیں۔“

پھر کلو نے ہاتھ بڑھا کر تپائی پر رکھے مٹھائی کے ڈبے سے پولی تھین کا لفافہ اتارا اور اسے کالو کو دکھا کر ہوا میں اچھال دیا۔

پیڈل فین کی ہوا سے پولی تھین کا خالی لفافہ صحن میں دور تک اڑتا چلا گیا۔ کالو لفافے کی طرف یوں لپکا جیسے۔۔۔۔۔۔ کیا بتاؤں

کیسے؟۔۔۔۔۔۔ تو بہ تو بہ کرنی چاہے اور رب سچے کی قدرتوں سے ڈرنا چاہیے۔۔۔۔۔۔ آخر اس نے لفافہ پکڑ لیا اور اسے دانتوں

سے کاٹ کاٹ کر یوں چبانے لگا جیسے چیونٹم اور بل چباتے ہیں۔

”اس بے چارے کو پیٹ بھرنے کے لئے کچھ نہیں ملتا اس لئے ایسا کرتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس کا پیٹ۔۔۔۔۔۔“ ممائی بولیں ”اندھا کنواں ہے کوئی کیسے بھر سکتا ہے۔“

”ہاں بھاء جی۔۔۔۔۔۔“ شمینہ کہنے لگی ”اسے کھانے کے لئے جتنا وقت دیتے جاؤ یہ کھاتا چلا جاتا ہے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ خواہ

کتنی روٹیاں ہوں۔ آخر کار کھانا ختم ہو سکتا ہے مگر اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔“

”عجیب بات ہے۔“ میں نے کہا ”مجھے تو یہ کوئی بیماری معلوم ہوتی ہے۔ کیوں ماموں جان؟“

ماموں جان کے اندر کا طبیب جاگ پڑا۔ کہنے لگے۔۔۔۔۔۔ ”ہاں ایک مرض ہوتا ہے یونانی طب میں اسے بولیموس کہتے ہیں۔ جوع البقر یعنی بیل بھوک اور جوع الکلب یعنی کتے کی بھوک بھی اسی کے مختلف نام ہیں۔ اس میں نہ مٹنے والی بھوک لگتی ہے۔ مریض کو بھوک کا ہوکا ہوتا ہے۔ معدے کی مزمن سوزش سے بھی بار بار غذا کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔“

”کہیں ایسا تو نہیں۔۔۔۔۔۔“ میں نے کہا ”کئی صدیوں کی بھوک اس کے اندر جمع ہو گئی ہو بھوک کا مرض جب نسل در نسل چلتا کرانک ہو جاتا اور آدمی کے خمیر میں شامل ہو جاتا ہے تو شکل بدل بدل کر انوکھے طریقوں سے اپنا اظہار کرتا ہے۔“

”بھاجی کی باتیں سن کر میری بھوک بھی مر گئی ہے۔“ شمیمہ کہنے لگی ”ابا جی آپ اس کا علاج کریں نا“

”اس کا کوئی علاج نہیں“ ماموں جان نے کہا ”اسے پرہیز کی ضرورت ہے جو وہ کر نہیں سکتا۔“

”علاج تو انسانوں کا ہوتا ہے“ ممائی بولیں ”یہ آدمی تھوڑی ہے اللہ نے عجیب مخلوق پیدا کی ہے مجھے تو یہ آدمی کی جون میں راکھش نظر آتا ہے جو اس گاؤں کی ہر چیز کھا جائے گا اور قحط پیدا کر دے گا۔ اس کا پیٹ دیکھ رہے ہو پورا دوزخ ہے۔“

”مجھے تو یہ پولی تھمین کے لفافوں سے بھرا ہوا لگتا ہے۔“ احمد نے کہا۔

اس پر سب ہنسنے لگے۔ پھر ککونے ڈنڈالے کر پلے اور کالو کو باہر نکال دیا اور کنڈی لگا دی۔

اس کے بعد میں اپنے آبائی گاؤں کے لئے روانہ ہو گیا۔ دو ایک روز وہاں قیام کیا۔ پھر واپس شہر آ گیا۔ مگر میں جب بھی بازار جاتا اور دکاندار مجھے ڈبل روٹی، انڈے، دودھ کے پیکٹ اور دوسرا سودا سلف پولی تھمین کے لفافوں میں ڈال کر دیتا تو مجھے کالو یاد آ جاتا اور میں سوچتا۔ نفیست ہے کہ وہ گاؤں میں رہتا ہے جہاں پولی تھمین کے لفافے نسبتاً کم استعمال ہوتے ہیں اگر وہ شہر میں ہوتا جہاں اب ہر چیز پولی تھمین کے لفافوں میں ملتی ہے تو یہ نہیں پولی تھمین کھا کھا کر اس کا کیا حال ہوتا۔

پھر میں نے پولی تھمین کی ماہیت اور کیمسٹری جاننے کی کوشش کی۔ دراصل میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ کس حد تک نقصان دہ ہے مگر مجھے کچھ زیادہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے دو ایک ڈاکٹر دوستوں سے بھی دریافت کیا کہ پولی تھمین کھاتے رہنے سے آدمی کو کیا اور کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے مگر انہوں نے کبھی اس انوکھی غذا کے بارے میں کسی کتاب میں پڑھا ہوتا تو مجھے کوئی ڈھنگ کا جواب دیتے۔

پھر آہستہ آہستہ مجھے یہ واقعہ بھول گیا۔ ویسے بھی میں نے یاد رکھ کر کیا کرنا تھا۔ میں کالو کی کیا مدد کر سکتا اور اسے پولی تھمین کھانے

سے کیسے روک سکتا تھا۔ اس طرح سال دو سال عرصہ گزر گیا۔

ابھی چند روز ہوئے ماموں جان ہمارے پاس آئے تھے۔ رات کو ہم دیر تک بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ کھدائی سے مزید دستیاب ہونے والی چیزوں، گاؤں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں، رشتہ داروں کے لڑائی جھگڑوں اور گھریلو مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔ ماموں جان تھکے ہوئے تھے میں انہیں آرام کرنے کا مشورہ دے کر جانے لگا تو اچانک مجھے کالو یاد آ گیا اور میں دوبارہ ان کے پاس بیٹھ گیا اور اس کی خیریت دریافت کی۔

”مر گیا ہے۔“ ماموں جان نے مختصر سے جواب دیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔“ مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ ”کب؟“

”کئی مہینے ہو گئے ہیں۔“ ماموں جان نے جواب دیا۔ ”اچھا ہو گیا اس کی ماں بہت تکلیف میں تھی ہر وقت لفافے چنتی رہتی تھی۔“

”مجھے پہلے ہی ڈرتھا۔“ میں نے کہا ”کہ وہ پلاسٹک کھا کھا کر بیمار پڑ جائے گا اور جلد مر جائے گا۔“

”ہاں“ وہ بولے ”مراتو وہ پلاسٹک کے لفافے کی وجہ ہی سے تھا مگر کھا کر نہیں۔“

”کیسے؟“

”بجلی کے کھمبے پر اسے پلاسٹک کا لفافہ نظر آیا جو ہوا سے اڑ کر وہاں اٹک گیا تھا۔ وہ کھمبے پر چڑھ گیا اور بجلی کا شاک لگنے سے مر

گیا۔ میں نے خود تو دیکھا نہیں مگر لوگ بتاتے ہیں کہ مرتے وقت بھی اس کے منہ میں مومی کاغذ کا ٹکڑا تھا۔“



نظر کا دھوکہ

لڑکی تو گھر کی تھی۔ زیادہ مشکل تو لومڑی کے حصول میں پیش آرہی تھی۔

خیر دین کوشش میں تھا کرائے پر مل جائے۔ مگر اب تک کامیابی نہ ہوئی تھی۔ مایوس ہو کر اس نے اعلان کر دیا۔ ”اگر لومڑی نہ مل سکی تو اس مرتبہ میلے میں نہیں جائیں گے۔“

”کیوں ابا؟“ فیکے نے پوچھا۔

”پتر بکری میں لوگ اب دلچسپی نہیں لیتے پھر کم بخت میا نے لگتی ہے۔“

”کوئی سانپ سہنی کوئی ناگ ناگن ابا؟“ فیکا میلے میں جانے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔

”وہ کھیل اب پرانا ہو چکا ہے۔“ خیر دین نے جواب دیا۔

لومڑی نہ ملنے کی خبر سن کر وہ خوش ہو رہی تھی۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگتی اللہ کرے ابا کو بھی لومڑی نہ ملے۔ مگر اس کی دعا قبول نہ ہوئی اور جب میلہ شروع ہونے میں تین چار روز رہ گئے تو ابا منہ مانگے دام دے کر لومڑی خرید لایا۔ اور لاؤڈ سپیکر پر اعلان کرنے کے سے انداز میں بولا ”چلو چلو تیار ہو جاؤ۔ جلدی کرو۔“

ابا کا اعلان سن کر اس کا سر گھومنے لگا۔ میلے کا سارا شور کانوں میں گونجنے لگا۔ اسے لگا وہ موٹر سائیکل پر سوار موت کے کنوئیں میں نیچے ہی نیچے گرتی چلی جا رہی ہے۔

وہ کئی برسوں سے تماشا بن رہی تھی۔ اس کے چہرے کے ساتھ کئی طرح کے دھڑ لگتے رہے تھے۔ کبھی ناگن کا کبھی بکری کا اور کبھی لومڑی کا۔ ایک ہی پوز میں پہروں بیٹھے بیٹھے اس کی کمر دکھنے لگتی۔ ٹانگیں شل ہو جاتیں۔ بعض اوقات اسے لگتا جیسے اس کا دھڑ بکری یا لومڑی میں تو نہیں البتہ پتھر میں ضرور تبدیل ہو گیا ہے۔ اسے اپنے چہرے سے جس پر اسے بہت ناز تھا نفرت سے ہوتی جا رہی تھی۔ اسی کی وجہ سے اس کا باقی دھڑ بے معنی ہو گیا تھا۔ اس کا جی چاہتا وہ چہرے سمیت اپنی گردن اتار کر رکھ جائے اور خود کہیں دور بھاگ جائے۔

تماشائیوں میں ہر عمر اور وضع کے لوگ شامل ہوتے۔ مگر صرف بچے حیرت، تجسس اور دلچسپی کا مظاہرہ کرتے۔ بڑی عمر کے مرد

اسے بھوکی اور لپٹائی نظروں سے دیکھتے۔ لڑکے فقرے کہتے، کوئی آنکھ مارتا کوئی سیٹی بجاتا اور کوئی فحش اشارے کرتا۔ سارا وقت نظروں اور فقروں کے کنکرا سے اندر سے لہو لہان کرتے رہتے۔ پھر بھی وہ جیسا اسے سکھایا گیا تھا مسکراتی رہتی اور ہشاش بشاش نظر آنے کی کوشش کرتی۔ اسے بت بنے بیکار بیٹھا رہنا بالکل اچھا نہ لگتا تھا۔ اسے تھیزوں اور سرکسوں کی لڑکیوں پر رشک آتا جو حرکت میں رہتی تھیں۔ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھیں۔ گاتیں، ناچتیں یا کرتب دکھاتیں۔ میلے میں ہر جگہ ہر شخص حرکت میں رہتا۔ صرف وہی ایک پتھر بنی بیٹھی رہتی۔ ٹھکن اور اکتاہٹ کا شکار ہو کر بھی اسے خوش و خرم نظر آنے کا سوانگ رہنا پڑتا۔ بے ہودہ باتوں کو بھی خندہ پیشانی سے سہنا پڑتا۔ ناگوار چہروں کا بھی مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کرنا پڑتا اور یہ سلسلہ رات گئے تک چلتا رہتا۔ اور وہ اس قدر تھک اور اکتا جاتی کہ بعض اوقات اس کا جی چاہتا زور زور سے رونے اور چیخنے لگے۔ ذہنی اذیت سے بچنے کے لئے وہ کبھی کبھی ارد گرد سے تعلق توڑ لیتی اور کہیں دور پہنچ جاتی۔ جاگتے میں بیٹھے بیٹھے سنے دیکھتی۔ چہروں کے ہجوم سے کٹ کر اپنی پسند کا چہرہ تخلیق کرتی۔ ایسے عالم میں اسے پتہ ہی نہ چلتا کتنا وقت گزر گیا۔ کتنے اور کیسے کیسے لوگ آئے اور کیا کچھ کہہ کر چلے گئے۔ اگر وقت گزارنے کا یہ احساس اس کے ہاتھ نہ آتا تو وہ اب تک یقیناً گھبرا کر کہیں بھاگ گئی ہوتی یا پاگل ہو چکی ہوتی۔

”شیدا اب نہیں جائے گی۔“ اس کی ماں نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”کیوں نہیں جائے گی۔“ خیر دین نے بگڑ کر پوچھا۔

”اب وہ بڑی ہو گئی ہے۔“

”ایک سال میں؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ پچھلے سال وہ چھوٹی ہی تھی۔ لڑکیاں تو کھمبیاں ہوتی ہیں انہیں بڑھتے کچھ دیر نہیں لگتی۔“

”اچھا زیادہ باتیں نہ بنا اور اس کی تیاری کر۔“

”اب اس کا جانا ٹھیک نہیں، کچھ تو خیال کرو۔“

”کچھ نہیں ہوتا تو اپنی بک بک بند کر۔“

”میں اسے اکیلا نہ جانے دوں گی۔ ساتھ چلوں گی۔“

”تو وہاں کیا کرے گی؟“

”اس کا خیال رکھوں گی۔“

”میکے اپنی ماں کو بتا کہ غریب آدمی کو پیٹ پالنے کے لئے سو طرح کے جتن کرنا پڑتے ہیں۔“

”ہاں اماں بہت پا پڑ بیٹے پڑتے ہیں۔“

”تم لوگ اب کوئی دوسرا دھندہ کیوں شروع نہیں کر دیتے؟“

”اچھا اچھا وہ بھی کر دیں گے۔ چلو میکے تیاری کرو۔“

اور تیاری شروع ہو گئی۔

شیداں نے اپنی ضرورت کے چھوٹی موٹی چیزیں کپڑے اور برتن سوٹ کیس میں رکھنا شروع کر دیئے۔ گرمی اور جس کے دن تھے اسے پہروں پردوں کے درمیان جہاں ہوا کا گز نہیں ہوتا تھا بیٹھنا پڑے گا۔ اس خیال سے بھاگاں نے سارے کام چھوڑ کر اسے کپڑوں کا نیا جوڑا سی دیا۔ میکے نے قاتیں، شامیانہ، میز، سٹول، پردے اور دوسرا سامان باندھ دیا اور وہ چاروں خیر دین، فیر کا، لڑکی اور لومڑی منہ اندھیرے روانہ ہو گئے۔

میلے کا پہلا دن عورتوں اور بچوں کے لئے مخصوص تھا۔ اگرچہ اس میں بھی مردوں ہی کی تعداد زیادہ تھی۔ باتیں کرنے والی لومڑی میں بچے زیادہ دلچسپی لیتے تھے اس لئے خوب بکری ہوئی سارا دن لکٹ بکتے رہے۔ خیر دین بہت خوش تھا۔ اس نے دونوں وقت بہت اچھا کھانا منگا یا۔ اسے آئس کریم بھی کھلائی اور چوڑیوں اور سک سرے کے لئے بھی کچھ پیسے دیئے مگر اگلے روز بارش ہو گئی اور دن بھر وقفوں کے ساتھ بوند باندی کا سلسلہ جاری رہا۔ کاروبار ٹھپ رہا مگر اسے آرام کرنے کا موقع مل گیا۔

میلے کا آج تیسرا روز تھا۔ اگرچہ گرمی بہت تھی اور ہوا بالکل بند تھی مگر صبح ہی سے جوق در جوق میلے میں اٹنا شروع ہو گئے تھے۔ دوپہر تک میلہ بھر گیا اور رونق عروج پر پہنچ گئی۔ کھوے سے کھوا چلنے لگا۔ دکانوں اور کھانے پینے کی اشیاء کے اسٹالوں پر بھیڑ ہو گئی۔ مدار یوں، سپیروں، جادو کے کمالات، کھانے، ریچھ سے کشتی لڑنے، جنسی طاقت کی دوائیاں بیچنے اور انگلی سے چھو کر درد کے بغیر دانت نکالنے والوں کے گرد تماشائیوں نے پرے بنائے تھے۔ تھیٹر آباد ہو گئے تھے گانوں اور مکالموں کا شور باہر بھی سنائی دے رہا تھا۔ ایک طرف ہیر سیال بھتہ لے کر ہیلے کی طرف روانہ ہو رہی تھی مگر راستے میں کسی نے ویل دے کر ٹوسٹ ڈانس کی فرمائش کر دی۔ دوسری طرف میاں مجنوں بن میں لیلیٰ لیلیٰ پکارتا ہوا اچانک جگنی گانے لگا۔ سرکس میں تماشائیوں کے لئے کرتبوں کے علاوہ بھی دلچسپی کی چیزیں تھیں۔ مرمریں ناگمیں، کسے ہوئے بدن اور گلابی چہرے۔ ٹکٹ نہ خرید سکنے یا خریدنے کا فیصلہ نہ کر سکنے والوں کے لئے تھیٹروں، سرکسوں کے باہر دلچسپی کا سامان موجود تھا۔ بلند مچانوں پر مسخرے اور عورتوں کے لباس میں بھجورے فلمی گیتوں کی دھنوں پر

ناچتے اور کو لھے مٹکاتے۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلتی تو اس کی آواز دور دور تک سننے والوں میں جوش اور اشتیاق پیدا کرتی۔ مردوں سے بھرے میلے میں ونجاروں اور بھکاروں کے علاوہ عورتیں صرف سرکسوں اور تھیٹروں کے اندر تھیں اس لئے سب لوگوں کا رخ ادھر کو تھا۔ گھروں اور کھیتوں میں کام کرنے والی عام اور میلی کچلی عورتوں کے مقابلے میں وہ انہیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آتی تھی۔

خیر دین کا خیال تھا آج خوب نکٹ بکس گے مگر اب وہ پریشان ہو رہا تھا۔ صرف اکا دکا لوگ ہی ادھر کا رخ کرتے تھے۔ لومڑی عورت کے انکلوڑ کی تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر ہجوم کے بادل سارے میلے پر برس رہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر پر بول بول کر اور لوگوں کو پکار پکار کر اس کا گلا بیٹھ چلا جاتا تھا۔

”لوگ ادھر کیوں نہیں آتے۔“ اس نے میکے سے سوال کیا۔

”لگتا ہے لوگوں کو لومڑی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی اب۔“ میکے نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”کیوں میکے؟“

”اب ہر آدمی اندر سے لومڑ بن گیا ہے اب۔“

”وہ کیسے میکے؟“

”وہ بکری اور لومڑی کی کہانی تمہیں یاد ہے اب۔ لوگ چالاک اور خود غرض ہو گئے ہیں۔ دوسروں کو گڑھے میں گرا کر ان کے کندھوں پر سوار ہو کر خود باہر آ جاتے ہی۔“

”مگر پرسوں تو خوب رونق تھی میکے“

”پرسوں عورتوں اور بچوں کا دن تھا اب۔“

”پھر کیا کریں؟“

”اب کوئی اور دھندہ سوچ اب۔“

”ہاں تمہاری ماں بھی یہی کہتی رہتی ہے۔“

خیر دین کو لومڑی پر اٹھنے والی رقم ضائع ہوتی نظر آ رہی تھی۔ وہ کوئی دوسرا دھندہ شروع کرنے کے بارے میں پہلی بار سنجیدگی سے غور کرنے لگا مگر پھر ایک عجیب بات ہوئی۔

سہ پہر کے قریب جب جس بڑھ گیا تھا اور سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، ٹکٹ تیزی سے بکنے لگے اور پھر اس میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔

پہلے تو وہ خوش ہوا مگر پھر یہ دیکھ کر چونکا کہ اندر جانے والے باہر آنے کا نام نہیں لیتے اور جن کورس کی وجہ سے فیکا باہر نکلنے پر مجبور کر دیتا ہے وہ نیا ٹکٹ خرید کر دوبارہ اندر آ جاتے ہیں۔ اس نے میکے سے لوگوں کی غیر معمولی دلچسپی کی وجہ معلوم کرنا چاہی تو اس نے ہنس کر جواب دیا۔

”بس بھیڑ چال ہے ابا، لوگ جدھر رش دیکھتے ہیں دیکھا دیکھا ادھر ہی کا رخ کر لیتے ہیں۔“

ایسا کبھی کبھی پہلے بھی ہو جاتا تھا اچانک تماشا یوں کا ریلو اسٹا آ جاتا اور پھر موت اور گاہک کا کیا پتہ کب آ جائے۔ اس خیال سے وہ مطمئن اور مسرور ہوا اور دھڑا دھڑا ٹکٹ بیچنے میں مصروف ہو گیا۔

تماشا یوں کی تعداد اور جوش و خروش لمحہ بہ لمحہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ ٹکٹ لینے والوں کی پہلی بار قطار لگ گئی۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے پھر میکے کو اپنے پاس بلایا اور آہستہ سے پوچھا۔

”خیر تو ہے آخر آج کیا بات ہو گئی ہے؟“

”سب ٹھیک ہے ابا۔“

”کوئی بات تو ہے؟“

”بس ابا گرمی بہت ہے۔“ فیکا ہنسنے لگا۔

”یہاں کون سی برف پڑ رہی ہے فیکے؟“

”تم ٹکٹ بیچو ابا۔“

”مگر فیکے، یہاں چانک؟“

”کچھ نہیں ابا۔ بس نظر کا دھوکہ ہے۔“ فیکا ہنستا ہوا چلا گیا۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا مگر اسے میکے کی ہنسی عجیب عجیب اور معنی خیز محسوس ہوئی اس نے تھوڑی دیر کے لئے ٹکٹ بیچنا بند کئے اور خود مچان سے اتر کر تماشا یوں کے پاس آیا اور یہ دیکھ کر ٹھنک گیا کہ پردہ سرک جانے کی وجہ سے لومڑی کے ساتھ ساتھ لڑکی کا اوپر کا دھڑ بھی صاف نظر آ رہا ہے۔ پہلے تو اسے شبہ ہوا کہ وہ تماشا یوں ہی سے نہیں کرتے سے بھی بے نیاز ہو کر بیٹھی ہے مگر پھر فوراً ہی اندازہ

ہو گیا کہ باریک کرتے بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گیا اور جلد کی رنگت اختیار کر گیا ہے۔ اس نے شاید گرمی کی وجہ اور اس خیال سے کہ اس کا چہرہ ہی دکھائی دیتا ہے کرتے کے نیچے کچھ بھی پہننا ضروری نہ سمجھا تھا۔ اسے فیکے پر غصہ آیا وہ جلدی سے واپس اپنی جگہ پر آیا کہ فیکے کو ڈانٹ کر پردہ ٹھیک کرنے کو کہے اور خود شو بند کرنے کا اعلان کرے مگر پھر اس کی نظر تماشائیوں کی لمبی قطار پر پڑی اور وہ جلدی جلدی ٹکٹیں بیچنے لگ گیا۔



پنج کلیان

مگر یار یہ سب ہوا کیسے؟

”بس ہو گیا۔۔۔۔۔ یوں سمجھ لو کہ درمیان میں ایک بھینس آ گئی تھی۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ایک راس بھینس، پنج کلیان، رنگ سیاہ، سینگ کنڈھے۔“

”تم تو راہداری کا مضمون سنانے لگے۔۔۔۔۔ ویسے بائی دی وے۔۔۔۔۔ یہ پنج کلیان کیا ہوتی ہے؟“

”جس کے چاروں کھروں کو سفید ہو کلیوں کی طرح اجلا۔ ایسی بھینس کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھینس بھی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں بہت خوبصورت تھی مگر مارنے والی تھی۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ کیا بھینسیں مارتی بھی ہیں؟“

”بعض جوشیلی اور غصیلی بھینسیں مارنے والی ہوتی ہیں۔ اجنبی آدمی کو دیکھ کر بھڑک اٹھتی اور حملہ کر دیتی ہیں۔“

”اچھا یار۔۔۔۔۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ سست الوجود اور صابر و شاکر قسم کا جانور ایسا بھی کر سکتا ہے۔“

”اچھا اب تو یہ چل گیا ہے آئندہ محتاط رہنا۔“

”اچھا تو پھر کیا ہوا؟“

”ہونا کیا تھا۔۔۔۔۔ اے بھی میرا مطلب ہے صبیحہ کو بھی تمہاری طرح علم نہیں تھا کہ مارنے والی بھینسیں بھی ہوتی ہیں۔“

”ہاں وہ ویٹرنری ڈاکٹر تھوڑی تھی جو اسے مویشیوں کے بارے میں کچھ پتہ ہوتا۔“

اسے تو ابھی آدمیوں کے بارے میں بھی زیادہ پتہ نہ تھا مگر میں نے اسے مشورہ دیا کہ جب گاؤں آئے تو عام استعمال کی کچھ دوائیں اور فرسٹ ایڈ کا سامان وغیرہ ساتھ رکھے۔ گاؤں کی عورتیں اس سے دوا دارو کا تقاضا کریں گی۔ اور اس سے اس کی ہی نہیں ہماری عزت اور وقار میں بھی اضافہ ہوگا۔“

”اس کے گھروالوں نے اسے بھیج کیسے دیا تمہارے ساتھ؟“

”یار میرے ساتھ کہاں۔۔۔۔۔ میں تو ایک ہفتے کی چھٹی لے کر پہلے ہی گاؤں چلا گیا تھا۔ وہ اپنے بھائی سہیل کے ساتھ دو روز بعد

وہاں پہنچی۔“

”پروگرام کیا تھا؟“

”کچھ نہیں گاؤں کی سیر کرنے۔ اصل میں تم جانتے ہو اس کے ڈیڈی ہر کام بڑے منظم طریقے سے کرنے کے عادی ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی بہانے خود اس ماحول اور گھر کو ایک بار دیکھ آئے جو اس کا سسرال بننے والا تھا۔“

”اچھا تو پھر؟“

”پھر ہوا یہ کہ جب یہ لوگ گاؤں سے ایک میل ادھر نہر کے پل کے پاس پہنچے تو سہیل کی نظر ٹمپیرچر کی سوئی پر پڑی جو خطرے کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ اس نے گاڑی روک دی اور ایک خالی ڈبے میں نہر سے پانی لالا کر انجن کو ٹھنڈا کرنے لگا۔ صبح کو شاید گرمی لگی وہ کار کا دروازہ کھول کر ایک طرف درخت کے سائے میں کھڑی ہو گئی۔ وہاں بروالوں کے مویشی چر رہے تھے۔ ان کے چرواہے کا نام بابا قادر ہے وہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ ان مویشیوں میں وہ بیچ کلیان بھینس بھی تھی جو کئی آدمیوں اور عورتوں کو زخمی کر چکی تھی اور جس سے گاؤں کے لوگ کتر کر گزرتے تھے۔ گھاس چرتے چرتے وہ عین صبح کے قریب آ گئی۔ اب صبح کی بلا جانے کہ وہ کس کی بھینس تھی اور حملہ بھی کر سکتی تھی۔ اس نے دیکھا بھینس کی دائیں پسلیوں کے پاس زخم تھا جس میں پیپ پڑ گئی تھی اور اس پر کھیاں بیٹھی تھیں۔ اس کا ہمدردی کا جذبہ جاگا۔ پوری نہ سہی آدھی پونی ڈاکٹر تو تھی۔ دوڑ کر گاڑی سے بیلا ڈونا کی ٹیپ نکال لائی اور زخم صاف کر کے اس پر چپکا دی تاکہ مکھیوں سے زخم محفوظ رہے۔ جب بابا قادر نے کہیں سے نمودار ہو کر اسے خطرے سے آگاہ کیا اس وقت وہ اپنی مریضہ کی مرہم پٹی کر کے اظہار محبت کے طور پر اس کی تھوٹھنی تھپتھپا رہی تھی۔ بابا قادر کے کہنے پر وہ وہاں سے ہٹ گئی اور جا کر کار میں بیٹھ گئی۔ بعد میں اسے بھینس کے بارے میں یہ جان کر بہت خوف آیا کہ وہ اس پر حملہ بھی کر سکتی تھی مگر اب اس خوف کی نوعیت ایسی تھی جیسے قریب سے سانپ نکل جانے کے بعد محسوس ہوتا ہے۔“

”اچھا تو بھینس کو یہ زخم کیسے آیا؟“

”یہ دو تین ہفتے پہلے کی بات تھی کہ اسے کھیت میں چرتے چرتے شتا ہلاڑ گیا تھا۔“

”کیا لڑ گیا تھا؟“

”شتا ہلا“

”یہ کیا ہلا ہوتی ہے؟“

”یہ ایک سستی اور معمولی قسم کی چارا گھاس ہوتی ہے اس میں زہریلے کیڑے ہوتے ہیں کاٹ اور کتر کر کھلائی جائے تو خطرہ کم ہوتا ہے ورنہ عام طور پر اس سے سخت قسم کا اچھارہ ہو جاتا ہے۔ مویشی کا پیٹ غبارے کی طرح پھول جاتا ہے کبھی خود ہی یا ٹوٹنے ٹوٹکوں سے ٹھیک ہو جاتا ہے مگر بعض اوقات مویشی اس سے ہلاک بھی ہو جاتے ہیں۔“

”اگر ایسی ہی خطرناک گھاس ہے تو شنبلا تو کسان لوگ اس کی کاشت ہی کیوں کرتے ہیں؟“

”ڈوبنے کے ڈر سے لوگ دریا میں اترنا نہیں چھوڑ دیتے۔ غریب لوگ ناقص اور سستی چیزیں کھا کر بیمار پڑتے ہیں مگر وہی کچھ کھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ شنبلا بھی ایک سستی اور جلد بڑھنے والی گھاس ہے، بہر حال سیانے کسان اسے کھلانے سے پہلے کتر لیتے ہیں بلکہ اس میں کچھ سوکھا بھی ملا لیتے ہیں۔“

”اچھا تو بیچ کلیان کو شنبلا لڑ گیا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حالت غیر ہو گئی۔ بابا قادر نے کسی لڑکے کو گاؤں دوڑایا کہ وہ بھینس کے مالکوں کو اطلاع دے اسے یہ بھی تاکید کی کہیں سے سوا لیتے آئیں۔“

”یہ سوا کیا ہوتا ہے؟“

”سوئی کا مذکر سمجھ لو۔۔۔۔۔ اسم مذکر کی تو تمہیں سمجھ نہیں آئے گی۔“

”کیوں سمجھ نہیں آئے گی جیسے نالی اور نالہ۔ گولی اور گولہ“

”ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر تم بات کرنے نہیں دیتے ہو درمیان میں اور سوال شروع کر دیتے ہو۔“

”ذرا میرا دیہات کے بارے میں جنرل ٹانج کمزور ہے۔“

”آخر ہونا شہری کے شہری۔“

”اچھا بابا اب نہیں بولتا مگر یہ سوا کیا کرنا تھا تمہارے اس بابا قادر نے؟“

”جب مویشی کے بچنے کی امید نہیں رہتی تو ان لوگوں کے پاس آخری حل یہی ہوتا ہے کہ سوا مار کر اس کے پیٹ سے ہوا خارج کر دیں۔ اس سوائے کے ساتھ چمڑے کا ایک کور سا ہوتا ہے وہ اندر رہ جاتا ہے اور سوا باہر نکال لیا جاتا ہے۔ ہوا کور کے سوراخ سے باہر نکلتی رہتی ہے۔ اس طرح عموماً مویشی کی جان بچ جاتی ہے اور دو چار ہفتوں میں زخم بھی بھر جاتا ہے مگر بعض اوقات یہ زخم سپک ہو جاتا ہے اور اس میں پیپ پڑ جاتی ہے۔ یہ زخم خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔“

”اچھا تو سوال کیا؟“

”نہیں جب کافی دیر تک گاؤں سے کوئی نہ آیا اور بھینس کی حالت غیر ہو گئی اور وہ جان کنی کے عالم میں زمین پر گر کر آخری سانس لینے لگی تو بابا قادر نے اپنی مسواک کاٹنے والی چھری اس کے معدے میں اتار دی۔ جس سے کچھ دیر تک گوبر ملی گیس کا فوارہ سا بہتا رہا اور تھوڑی دیر بعد بھینس نے بند ہوتی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بعد وہ ٹھیک تو ہو گئی مگر زخم ابھی مندل نہیں ہوا تھا اس میں پیپ پڑ گئی اور کھیاں اسے ستاتی رہتی تھیں۔“

”ظاہر ہے صبیحہ نے اسے مکھیوں سے نجات دلائی تھی وہ اس پر حملہ کیوں کرتی۔“

”نہیں سوال یہ پیدا ہوا کہ جب صبیحہ نے زخم پر ابھی ٹیپ نہیں لگائی تھی تو بھینس کو کیا علم تھا کہ وہ میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں پڑھتی ہے اس کے بیگ میں بیلاڈونا ٹیپ ہے اور تھوڑی دیر بعد وہ اس کی مرہم پٹی کر دے گی۔“

”ہاں یار یہ تو واقعی تعجب کی بات ہے کہ بھینس نے اس پر حملہ کیوں نہیں کیا۔“

”اسی ایک بات کو لے کر گاؤں والوں نے بات کا بٹنگلڑ بنادیا اور کئی طرح کی افواہوں نے جنم لیا۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ کمال ہے کوئی خاص بات ہو گئی؟“

”تم سنو تو۔۔۔۔۔ گاؤں میں جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو سارا گاؤں حیران رہ گیا کہ بروالوں کی بھینس نے ایک اجنبی

شہری لڑکی پر نہ صرف یہ کہ حملہ نہیں کیا بلکہ اس کا ہاتھ چاٹتی رہی ہے۔“

”تو کیا بھینس نے صبیحہ کا ہاتھ چاٹا تھا؟“

”پتہ نہیں یار چاٹا تھا کہ نہیں چاٹا تھا۔ تم کیوں جیلس ہو رہے ہو؟“

”میں کیوں جیلس ہونے لگا۔“

”بس لوگوں نے بات گھڑ لی ویسے بھی بھینس کا ہاتھ چاٹنا یا صبیحہ کا بھینس کا منہ تھپتھپانا ایک ہی بات نہیں ہے؟“

”ہاں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے دونوں باتوں میں۔“

”مگر لوگوں نے اسے اس طرح لیا جیسے وہ شیر کے پنجرے میں اتری ہو اور اس کی مونچھ کا بال اکھاڑ کر لے آئی ہو۔ لوگوں نے پر

کا کوا بنادیا۔۔۔۔۔ اصل میں سب سے زیادہ گڑبڑ موقع کے چشم دید گواہ بابا قادر نے کی۔ وہ ہر محفل میں بیان بدل کر اور حسب

موقع اور ضرورت کے مطابق خوب نمک مرچ لگا کر ایک ہی واقعہ کو مختلف طریقوں سے بیان کرتا رہا۔ ابتدا میں تو اس نے بھی من و عن

وہی کچھ بیان کیا ہوگا جو پیش آیا تھا مگر اس کا کہنا تھا کہ شہری لڑکی نے بھینس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے کیل دیا تھا اور وہ اس کے اذن کے بغیر حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ لڑکی کا لاعلم جانتی ہے۔ خاص طور پر ضعیف العقیدہ عورتوں نے جن کی دیہات میں کمی نہیں ہوتی یقین کر لیا کہ لڑکی ضرور جادو ٹونا جانتی ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ بھینس اس پر حملہ نہ کر دیتی۔

”اچھا تو حملہ نہ کرنے کا اصل سبب کیا تھا؟“

”جب تک تم پوری بات نہیں سنو گے تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔“

”چلو سناؤ۔“

”اگلے روز ہمارے ہاں دن بھر عورتوں اور لڑکیوں کا تانتا بندھا رہا اور وہ اس جادو گر کی کو دیکھنے آتی رہیں جو اپنے لباس، ہیر سائل، میک اپ اور بول چال میں انہیں عجیب اور انوکھی معلوم ہوتی تھی۔ وہ میک اپ یا کنگھی کرنے سنگھار میز کے سامنے بیٹھتی تو چھوٹی بڑی لڑکیوں سے کمرہ بھر جاتا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ گاؤں میں سے لیڈی ڈاکٹر کے طور پر کسی نے قبول نہیں کیا۔ یوں لگتا تھا وہ گاؤں میں شوٹنگ پر آئی ہوئی کوئی مشہور فلمی ہیروئن ہے جس کے گرد لوگ جمع ہیں۔ آپا سارا دن چھوٹی بڑی لڑکیوں کو دھکیل دھکیل کر باہر نکالتی رہتیں مگر وہ پھر آ جاتیں۔ دروازے میں یا چھت اور سیڑھیوں پر جمع ہوتیں۔

”بڑی عمر کی عورتوں کا کیا رد عمل تھا؟“

”ہاں وہ دلچسپ تھا۔ ماسی اللہ رکھی آئی تو کہنے لگی، بھلا بھینس نے اسے کیا مارنا تھا بے چاری خود مر مٹی ہوگی۔ نمبردار فتح محمد کی بیوی بھاگ بھری کہنے لگی، یہ تو خود سرتا پا جادو ہے اسے جادو ٹونا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ شیر و میراٹن نے کہا، صدقے جاؤں کیسے بھاگوں والی ہے جب سے اس گھر میں آئی ہے لوگوں کو اپنا گھر بوہا ہی بھول گیا ہے جہاں بیٹھتی ہے چائن ہو جاتا ہے رونقیں لگ جاتی ہیں۔ مگر سب سے دلچسپ ریمارکس ہماری ملازمہ دارو کے تھے وہ بہت ہی خوش ہو رہی تھی۔ کہنے لگی یہ اس گھر کی بہو بن کر آگئی تو مجھے ایسی مالکین مل جائے گی جو میرے گھٹنوں کے درد کا علاج بھی کرے گی اور جس کی اترن بھی میرے نئے کپڑوں سے اچھی ہوگی البتہ بعض عورتوں نے درمیان میں بیگی کا ذکر بھی کیا اور دبے دبے لفظوں میں اس کی تعریف کی۔ مگر کسی کو کھل کر بات کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔“

”وہ خود نہیں آئی؟“

”بیگی کے آنے جانے کا حال بعد میں بتاؤں گا۔“

”ایک پاگل عورت ہے۔“ آپا نے جواب دیا ”اکثر راتوں کو چھت پر بیٹھ کر اپنے مرے ہوئے شوہر کو یاد کرتی اور چیختی چلاتی رہتی ہے۔“

میں یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ صبیحہ نے کوئی سوال نہیں کیا جیسے سب کچھ جانتی ہو۔ امی کے کہنے پر وہ اٹھ کر اندر چلی گئی اور ٹی وی سے خبریں سننے لگی۔ ہم ایک ایک کر کے چھت پر آئے۔ پہلے تو بار بار نیکی کا نام سن کر ہم یہی سمجھے کہ خدا نخواستہ نیکی کو کچھ ہو گیا ہے مگر پھر پتہ چلا کہ وہ نیکی کا رشتہ ٹوٹنے کا ماتم کر رہی تھی۔

”تو کیا تمہارے ساتھ اس کے رشتے کی بات ہو چکی تھی؟“

”بالکل نہیں۔۔۔۔۔۔“ چاچی نے امی اور آپا سے سرسری سا ذکر ضرور کیا تھا اور انہوں نے جواب دیا کہ وہ مجھ سے پوچھ کر بتائیں گی۔ میں نے منع کر دیا تو بات وہیں رک گئی۔ مگر ان ماں بیٹی نے خود ہی سارے گاؤں میں رشتہ طے ہو جانے کی منادی کر دی تھی۔“

”پھر تو خیر ان کی زیادتی تھی۔“

”یہی بات تو مجھے سب سے بری لگتی تھی چاچی ضد کی بہت پکی تھی۔“

اپنی ہر بات منوانا چاہتی تھی۔ بہت عجیب و غریب مزاج ہے اس کا دراصل اوائل عمری سے بیوگی کے صدمے جھیل جھیل کر وہ بے حد زور رنج اور جذباتی ہو گئی تھی۔۔۔۔۔۔ بات بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتی۔ ماں بھی اپنی ماں پر گئی تھی۔ جوشیلی، غصیلی اور ضدی، غصہ اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ مجھے غصیلی اور جھگڑالو عورتوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ زندگی عذاب ہو جاتی ہے ورنہ سچی بات ہے مجھے اس کے ان پڑھ یا دیہاتی ہونے پر کوئی اعتراض نہ تھا اور صبیحہ کا اس سے کیا موازنہ۔۔۔۔۔۔ وہ زندگی سے یوں لبالب تھی کہ صبیحہ اس کے مقابلے میں کانچ کی خوبصورت مگر بے جان گڑیا معلوم ہوتی تھی۔“

”اب تو تم یہی کہو گے۔“

”نہیں اندر سے میں ہمیشہ ایسا ہی سمجھتا تھا۔“

”ہاں وہ تم چچی کے رونے کی بات کر رہے تھے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔۔“ چچی نہایت سراور لے کے ساتھ بین کر رہی تھی۔ ان کے بین گاؤں میں مشہور ہیں۔ جب کبھی گاؤں میں کوئی مرگ ہو جاتی ہے اور عورتیں ایک دوسری کے گلے لگ کر روتی ہیں تو چچی سب میں پیش پیش ہوتی ہیں وہ جس عورت کے گلے لگ کر بین

کرتی ہیں اسے رلا رلا کر ہلکان کر دیتی ہیں۔ ان کے بین سن کر سنگدل سے سنگدل انسان کا دل بھی پسچ جاتا ہے۔ اور اس وقت بھی وہ اسی طرح بین کر رہی تھی جیسے کوئی مر گیا ہو۔“

”لوگ تو بہت متاثر ہوئے ہوں گے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ تم یقین جانو، جب ہم چھت پر کھڑے یہ بین سن رہے تھے تو خود ہمیں اپنے پاؤں تلے کی چھت سرکتی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ کھانا کھاتے لوگوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لئے ہوں گے۔ کئی عورتوں کے ہاتھوں سے برتن گر کر ٹوٹ گئے ہوں گے۔ گاؤں کی ہر چھت پر عورتیں اور آدمی نظر آ رہے تھے۔ بنگی کی ماں کے گرد عورتوں کا جھوم تھا جو اسے تسلیاں دے رہی تھیں اور رونے سے منع کر رہی تھیں۔ ان میں چودھری جہان داد کی بیوی کنیز بی بی بھی تھی جو بلک بلک کر رو رہی تھی۔“

”صبحہ نے پھر کچھ نہیں کہا؟“

”میرا خیال ہے وہ بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔ جو کچھ گاؤں کی ہوا میں تھا وہ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ آپا کو یہ بھی شک تھا کہ جو عورتیں دن بھر آتی جاتی رہی تھیں ان میں سے نیگی کی کسی ہمدردی نے چپکے چپکے اسے بہت کچھ بتا دیا ہوگا۔ ورنہ وہ اتنی گم صم نہ ہو جاتی۔ اگلی صبح اس نے اچانک روائگی کا اعلان کر کے ہمیں اور بوکھلا دیا۔

”تم نے روکا نہیں؟“

”ہم نے کوشش کی وہ کچھ دن اور رک جائے مگر وہ نہ مانی۔ سہیل پہلے ہی بورہور ہاتھا۔ ناشتے کے فوراً بعد وہ لوگ روانہ ہو گئے۔“

”اچھا تو کارواں چلا گیا؟“

”ہاں سات بجے کے قریب ہم انہیں گاؤں سے باہر تک رخصت کرنے گئے۔ واپس آئے تو چودھری جہانداد کا پیغام ملا۔ اس نے صبح ہی صبح مجھے ڈیرے پر بلا لیا تھا۔“

”یہ کون صاحب ہیں؟“

”یہ گاؤں کا ایک معمر چودھری ہے۔ زمین زیادہ نہیں ہے مگر سفید پوشی قائم ہے۔ پڑھا لکھا بالکل نہیں ہے مگر نہایت ذہین اور دانا آدمی ہے۔ گاؤں کے علاوہ قریبی دیہات اور تھانے کچھری میں بھی اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ اس لئے عام طور پر اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا ڈیرہ ایک طرح کی عدالت ہے جہاں جو مقدمہ پہنچ جاتا ہے لوگوں کو اس کے بارے میں یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا فیصلہ جلد اور صحیح ہوگا۔ میں خود اس کی بہت عزت کرتا ہوں مگر اس وقت مجھے بہت تاؤ آ گیا کہ آخر اسے

میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے اور مجھے وہ ڈیرے میں طلب کر کے مجھ پر کیوں دباؤ ڈالنا چاہتا ہے کہ میں بنگی سے بیاہ کر لوں۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اسے کھری کھری سناؤں گا مگر اس نے موقع ہی نہیں دیا۔ اٹھ کر گلے لگا یا نہایت شفقت سے پیش آیا اور میرے منع کرنے کے باوجود چائے پانی کے لئے نوکر کو دوڑا دیا۔ پھر دوسرے لوگوں کو اٹھ کر ساتھ والی بیٹھک میں چلے جانے کو کہا۔ وہ اٹھ کر چلے گئے تو بغیر کسی تمہید کے کہنے لگا ”میں تمہارے کسی ذاتی معاملے میں دخل دینا نہیں چاہتا نہ ہی ایسے معاملات میں زبردستی کا قائل ہوں۔ لیکن رات جو کچھ ہوا بہت برا ہوا۔ تمہارے مہمان کیا سوچتے ہوں گے کہ کیسے گنوار لوگ ہیں اس گاؤں کے۔۔۔۔۔۔ یہ سوچ سوچ کر مجھے رات بھر شرمندگی اور پریشانی رہی۔۔۔۔۔۔ سنا ہے وہ لوگ چلے گئے؟“

”ہاں ابھی ابھی رخصت ہوئے ہیں۔“

”طاہر پتر“ اس نے اپنی لمبی لمبی سفید مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”ان پڑھ آدمی ایک طرح سے ناپسندیدہ ہوتا ہے، تم پڑھ لکھے آنکھوں والے آدمی ہو تم بہتر جانتے ہو گے ویسے بھی تم جیسے پڑھ لکھے آدمی کی بیوی کو تعلیم یافتہ ہونا چاہیے۔ ہمارا زمانہ اور تھا۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا ”بنگی میں صرف ایک عیب ہے کہ وہ اپنی ماں کی طرح غصیلی اور جھگڑالو ہے۔“ وہ ہنس پڑا کہنے لگا ”اگر صرف اتنی سی بات ہے تو پھر سمجھ لو کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ غصیلی، لڑا کا اور جذباتی عورتیں دل کی اچھی اور شوہروں کی بہت وفادار ہوتی ہیں۔ دیکھ لو تمہاری چاچی نے اپنے شوہر کی یاد میں پوری زندگی گزار دی حالانکہ بہت سے لوگ اس سے نکاح کرنے کے خواہشمند تھے۔ میرا خیال ہے اس کی لڑکی بھی بالکل ماں پر گئی ہے۔ بہت محنت کرنے والی اور وفا شعار بیوی ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر وہ تمہیں پسند نہیں ہے تو نہ سہی۔ میں ان سے بات کروں گا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت پھر کبھی نہ کریں کہ تمہیں تمہارے گھر والوں یا مہمانوں کو اس قسم کی پریشانی اٹھانا پڑے۔“

”آپ ضرور انہیں سمجھائیں چاچا۔۔۔۔۔۔ بہت عجیب عورتیں ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ بروالوں کی بھینس کے قصے سے لے کر رات کے ہنگامے تک انہوں نے ہمارے مہمانوں کے سامنے ہمیں کس قدر شرمندہ کیا ہے۔“

”ہاں طاہر پتر“ میں وہ قصہ بھی سن چکا ہوں بروالوں کی بھینس والا۔ مگر میرا خیال ہے چھری لگنے کے بعد سے اس بھینس کی کایا پلٹ گئی ہے اور اب اس نے مارنا چھوڑ دیا ہے اس میں تمہاری مہمان لڑکی کا کوئی کمال نہ تھا۔ لوگوں نے خواہ مخواہ باتیں بنائیں۔ یا تم نے پوچھا نہیں چودھری سے کہ اسے کیسے معلوم ہوا بھینس نے مارنا چھوڑ دیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ کہنے لگا پتر، جو آدمی بزدل اور

”تمہاری آواز سن کر تو وہ اور پھر سکتی تھی۔“

”شاید مگر اچانک کنڈی کھل گئی۔ ہم سب لوگ اندر کی طرف دوڑے۔ اندر ایک طرف چارہ کترنے کی مشین تھی۔ دوسری طرف دودھ دینے والی گائیں بھینسیں اور نیل بندھے ہوئے تھے۔ باقی مویشی پچھلی جانب باڑے میں تھے جس کے ارد گرد خاردار سوکھی جھاڑیوں کی باڑ تھی۔ میں آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مارنے والی پنچ کلیان بھینس ایک طرف کھڑی جگالی کر رہی ہے اور نیکی اس کی گردن سے لپٹ کر رو رہی ہے۔ مجھے چوہدری جہاں داد کی ایک ایک بات سچ معلوم ہونے لگی۔ واقعی بھینس نے مارنا چھوڑ دیا تھا۔ محبت اور تحفظ کے احساس نے اس کا سارا خوف دور کر دیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑا اور کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ میرے ذہن سے ساری دھند چھٹ گئی تھی۔ میں نے اسے اس کی ماں کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ چاچی اس کی بیوقوف کو بتاؤ کہ غصہ اور ضد نہ کیا کرے کچھ دیر تو چاچی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر اچانک وہ مجھ سے لپٹ گئی اور کہنے لگی کہ تیرے ساتھ غصہ کرے گی تو میں اس کی ہڈیاں نہ توڑ دوں گی۔“

بس یار یہ ہے سارا قصہ۔ اب تو تمہیں پتہ چل ہی گیا ہوگا کہ یہ سب اچانک کیسے ہو گیا۔“

”بہت اچھا ہو گیا۔ مجھے بڑی خوش ہوئی ہے۔“

”ہاں بس اللہ نے کرم کیا ہے۔“

”اچھا یہ بتاؤ واپس آ کر تم صبیحہ کے گھر گئے؟“

”نہیں یار ڈر لگتا ہے۔“

”کس سے؟“

”پنچ کلیان سے۔“



پھلوں سے لدی شاخیں

گھر کے لوگ پہلے ہی تنگ آ چکے تھے۔ اب گاؤں کے دوسرے گھروں سے بھی آئے دن شکایتیں آنے لگیں۔ کبھی کسی ڈربے میں گھس کر مرغیوں کو تھس نہس کر دیتی کبھی کسی گھمائل میں اتر کر پالتو کبوتر ہڑپ کر جاتی۔ گھر والیاں ہر وقت ہوشیار خبردار رہتیں اور کھانے پینے کی چیزوں کو ڈھانپ کر رکھتیں مگر ذرا سی غفلت ہو جاتی تو وہ کھانے یا دورہ کے برتن میں منہ ڈال دیتی یا کسی بچے سے روٹی یا بوٹی چھین کر یہ جاوہ جا۔ لاکھ منع کرو ڈراؤ دھمکاؤ وہ میاؤں میاؤں کرتی گھسی چلی آتی۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ جس مقصد کے لئے اسے پالا گیا تھا وہ بھی پورا نہیں ہو رہا تھا۔ شروع میں جب وہ چھوٹی تھی اور گھر والوں میں سے کسی کے بستر میں گھس کر یا پانکٹی پر لیٹ کر سو جاتی تھی تو کسی کو برا نہیں لگتا تھا ان دنوں چوہے بھی اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔ وہ بھی رات کو اٹھ اٹھ کر گشت کرتی۔ مورچہ لگا کر بیٹھتی اور کئی کئی شب خون مارتی۔ خصوصاً سردیوں کی طویل راتوں اور پسار اور کوٹھڑیوں میں جہاں کبھی رات کو چوہے اودھم مچایا کرتے تھے اس نے گویا کر فیولگا رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ چوہوں نے بلوں سے باہر آنا چھوڑ دیا تھا اور غالباً دوسری طرف پڑوسیوں کے ہاں جانکے تھے مگر اب وہ سست اور کاہل ہو گئی تھی چوہے بھی خاصے نڈر اور چالاک ہو گئے تھے۔

طویل عرصہ تک مارشل لاء بھی لگا رہے تو اس کی خلاف ورزیاں عام ہو جاتی ہیں وہ تو پھر اکیلی جان تھی۔ پتہ نہیں چوہے طاقتور اور باغی ہو گئے تھے یا اس کا چوہوں کی صورت میں من و سلوئی سے جی اوبھ گیا تھا۔ اب وہ گھر میں نہیں نکلتی تھی۔ سارا دن گاؤں بھر کی چھتوں منڈیروں اور ڈربوں کی سیر کرتی۔ کبھی لوٹتی بھی تو رات گئے اس وقت جب اندر کے دروازے بند ہو چکے ہوتے وہ برآمدے یا رسوئی کے پاس بیٹھ کر رات بسر کرتی۔ جب وہ باہر خرائے لے رہی ہوتی تو اندر چوہے دندناتے اور شرانگیزیوں کر رہے ہوتے بعض اوقات گھر والوں کے لحافوں پر چڑھ کر اچھلتے کودتے۔ دوا یک بار سوتے میں چھوٹے بچوں کو کاٹ بھی کھایا۔

چوہے جب بہت تنگ کرتے دیکھیوں کے ڈھکنے اٹھتے پڑ چھتوں کے برتن گراتے، اناج کی بوریاں کترتے اور ہڑبونگ مچاتے تو بچے ڈر کر جاگ جاتے بڑوں کو دیر تک نیند نہ آتی۔ بڑی بہورات کو اٹھ اٹھ کر دروازہ کھولتیں کہ شاید وہ آوارہ گرد لوٹ آئی ہو مگر اکثر انہیں مایوسی ہوتی۔ کیونکہ اس نے رات بسر کرنے کے اور بہت سے ٹھکانے تلاش کر لئے تھے۔ ایک اور تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اگر کبھی دن یا رات میں وہ کوئی چھوٹا موٹا چوہا تفریحاً پکڑ بھی لیتی تو اسے پچھلی کوٹھڑی میں بستروں یا پسار۔ میں اوپر نیچے رکھی چار پائیوں پر

چڑھ کر کھاتی۔ اکثر ادھ کھائے لبو لبان چو ہے چھوڑ کر اپنی راہ لیتی چادر میں اور پچھونے خراب ہو جاتے کراہت کے مارے چھوٹی بہو کو متلی آنے لگتی۔

بڑی بہو کا خیال تھا کہ اس کا مکمل بایکٹ کیا جائے اور اسے کھانے پینے کے لئے کچھ نہ دیا جائے۔ آہستہ آہستہ دل برداشتہ ہو کر خود ہی گھر آنا چھوڑ جائے گی مگر کھانے پینے کی سلسلے میں اب وہ کسی کی محتاج تھی نہ کسی کا احسان لیتی تھی۔ چھوٹی بہو ڈنڈوں سے اس کی اچھی طرح پٹائی کرنے کے حق میں تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ دو چار بار یہ عمل دہرانے سے آئندہ کے لئے پیچھا چھوڑ دے گی مگر ایک تو وہ آسانی سے اس کا موقع نہ دیتی تھی ادھر ڈنڈا اٹھایا اور ادھر وہ چھلانگ لگا کر دیوار پر چڑھ جاتی اور دوسری طرف کود جاتی۔ دوسرے بڑی اماں سب کو ڈراتی رہتی تھی کہ بلی کو مارنے سے سخت گناہ ہوتا ہے اس کی کوک فریاد سیدھی آسمان پر جاتی ہے۔ اس کے باوجود گھر کے نوجوان لڑکوں نے اس کی کئی بار مرمت کر ڈالی مگر اس نے گھر چھوڑا نہ اپنی حرکتوں سے باز آئی۔ پھر وہ حاملہ ہو گئی اور گھر والیاں اس کی زیادتیوں کو برداشت اور اس کی چھین چھٹ سے چشم پوشی کرنے لگیں بلکہ خود اس کے کھانے پینے اور آرام کا خیال رکھتیں۔ گاؤں کی عورتوں نے بھی اس کی شکایتیں کرنا ترک کر دیا بلکہ اس کے بلوگڑوں کی پیدا ہونے سے پہلے ہی بکنگ ہو گئی۔

زچگی کے دنوں میں سب اس کی ہر زیادتی کو برداشت کرتے رہے وہ بلوگڑوں کو منہ میں لئے مختلف گھروں، آنگنوں اور چھتوں پر منتقل کرتی رہی۔ جدھر جاتی عورتیں اس کی خاطر مدارت کرتیں مگر وہ اگلے ہی روز انہیں کہیں اور لے جاتی۔ بڑی اماں کا کہنا تھا کہ وہ بچوں کو ضرور سات گھروں کا چکر لگوائے گی۔ پتہ نہیں سات گھروں کے چکر ابھی پورے ہوئے تھے یا نہیں کہ اس بلوگڑے بلوگڑیاں امیدواروں میں تقسیم ہو گئے۔ صرف ایک بھورے رنگ کی بلوگڑی کو شہناز عرف شانو نے گھر میں رکھ لیا۔ بڑی اماں اسے شانو کے وزن پر مانو کے نام سے پکارتیں۔ مانو رات بھر میاؤں میاؤں کرتی رہتی جس سے چوہوں کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں مگر خواہ وہ کتنے ہی پلے ہوئے تھے مگر تھے تو آخر چوہے اور وہ خواہ کتنی چھوٹی اور کمزوری تھی مگر تھی تو بلی کی بچی۔ ان کے رنگ میں بھنگ پڑ گئی اور انہوں نے کنارہ کشی کر لی۔

اب ایک تو بڑی کی ضرورت نہ رہی تھی دوسرے زچگی کے دنوں کی خاطر داریوں اور چشم پوشیوں نے اسے بالکل ہی بگاڑ دیا تھا۔ وہ بہت آوارہ اور نمدیدی ہو گئی تھی۔ اسے بھوک ہوتی یا نہ ہوتی وہ پالتو پرندوں اور کھانے پینے کی چیزوں کو خراب کرتی رہتی۔ سبھی اس سے تنگ آ چکے تھے۔ مگر بڑی اماں اس کی طرف داری کرتی تھیں۔ اس کی آوارہ گردی کا جواز انہوں نے یہ پیش کیا تھا کہ اس کے بچے گاؤں بھر میں منتشر تھے وہ محض ایک گھر میں مانو کے پاس تک کر کیسے بیٹھ سکتی تھی اور کھانے پینے کے برتنوں کو ٹھیک طرح سے ڈھانپ

کر نہ رکھنا بہوؤں کی نااہلی اور کج تھا۔

جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو چھوٹی بہو نے گھر کے لڑکوں اور ملازموں کو جمع کیا اور ان سے فرمائش کی کہ وہ کسی طرح انہیں اس دراجھی بلی سے نجات دلائیں۔ طے پایا کہ اسے پکڑ کر ایک بوری میں بند کر دیا جاوے اور کرموا سے لے جا کر کسی دوسرے گاؤں میں چھوڑ آئے۔ بڑی اماں کو پتہ چلا تو بہت پریشان ہوئیں کہنے لگیں۔

”ایسا مت کرو اس کے بچے یہاں ہیں اسے گاؤں بدر نہیں کرو۔“

مگر چھوٹی بہو کیسے مانتی۔۔۔۔۔ اس کی مرغی کے گیارہ چوزوں میں سے اب صرف چار باقی تھے۔ ایک تو خیر چیل اٹھا کر لے گئی تھی باقی سارے اسی کم بخت کے دوزخ میں اتر گئے تھے مگر سب سے مشکل مرحلہ اسے پکڑ کر بوری میں بند کرنا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح اسیل نہ رہی تھی کہ چکارنے اور پیار کرنے کا جھانسہ دے کر اسے قابو کیا جاسکتا۔ زبردستی کرنے سے اس کے جھپٹنے اور پکڑنے والے کو زخمی کر دینے کا ڈر تھا۔ آخر بڑی بہو کے منگلے بیٹے فیروز نے ایک روز مچھلیاں پکڑنے والا جال پھینک کر اسے پھانس لیا اور بوری میں بند کر کے کرموا کے حوالے کیا۔ بڑی اماں کو پتہ چلا تو چیخنے چلانے لگیں۔ شوہر کو چوپال سے بلا بھیجا مگر جب تک بڑے میاں گھر پہنچ کر موا سے سائیکل پر لا کر گاؤں سے دور لے جا چکا تھا۔

بڑی اماں کے سوا سب نے سکھ کا سانس لیا۔ اب مانو بھی گھر بھر کی توجہ کا مرکز تھی کبھی اس کی ماں کو بھی سبھی اسی طرح چاہتے تھے مگر اس سے چھٹکارا پا کر خوش تھے۔ بڑی اماں جب بھی بلوگلڑی کو دیکھتیں اداس ہو جاتیں اور کہتیں۔

”تم لوگوں نے بہت ظلم کیا ہے بے چاری بے زبان کو اس کے بچوں سے جدا کر دیا ہے۔ پتہ نہیں اس کا کیا حال ہوگا؟“

بڑی اماں کی باتیں اور مانو کی ہائے ہائے جیسی میاؤں میاؤں سے بہوئیں کبھی کبھی پریشان ہو جاتیں مگر جب اس اونٹری کے کرتوت یاد آتے تو ساری ہمدردی بھول جاتیں۔ لیکن ابھی چند ہی روز چین سے گزرے تھے کہ ایک صبح جب بڑی بہو نے پسار کا دروازہ کھولا تو وہ برآمدے میں مونڈھے پر نیم خوابیدہ لیٹی نظر آئی۔ خاصی تھکی ہوئی اور مضحل سی تھی پتہ نہیں کتنا فاصلہ طے کر کے اور کیسے پہنچی تھی۔ بچوں والی تھیں۔ ان کا دل پسچ گیا۔ رسوئی سے لا کر کھانے کو کچھ دیا۔ کھاپی کروہ میاؤں میاؤں کرتی ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ بڑی اماں کے کان میں اس کی آواز پڑی تو دروازہ کھول کر وہ بھی باہر آ گئیں۔ کہنے لگیں۔

”میں نے خواب دیکھا تھا لوٹ آئی ہے۔ میرا خواب سچ نکلا بہت اچھا ہوا۔“

دروازہ کھلا رہ گیا، مانو بھی اچھلتی کودتی باہر آ گئی۔ بڑی اماں اور بڑی بہو دونوں ماں بیٹی کا ملاپ دیکھ کر اور پسچ گئیں۔ مگر چھوٹی بہو

کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ داتن کرتے ہوئے انہوں نے اسے ایسے نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ ”اچھا میں تجھے سمجھ لوں گی مر دار“

بڑی اماں نے بہت سمجھایا، جیٹھانی نے منع بھی کیا۔ بڑے میاں اور شانو نے بھی درگزر کرنے کو کہا مگر چھوٹی بہو نے اسے انا کا مسئلہ بنا لیا تھا اور یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر وہ اس گھر میں رہے گی تو وہ چھوڑ کر میکے چلی جائیں گی۔ ایک مرتبہ پھر فیروز نے جال لگایا۔ کرم کو ہدایت کی گئی کہ اس بار وہ اسے اتنی دور چھوڑ آئے جہاں سے وہ کبھی نہ لوٹ سکے۔ بڑی اماں کو شک تھا کہ موا کرم موا سے ضرور کسی اندھے کنوئیں یا نہر میں پھینک آئے گا۔ انہوں نے اسے خدا کا خوف دلایا اور قسم لی کہ وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گا۔ انہیں امید تھی کہ وہ زندہ رہی تو ایک نہ ایک دن اپنے بچوں کے پاس پہنچ جائے گی۔

کرم نے پہلے کی طرح اسے بوری میں ڈال کر بوری کا منہ رسی سے بند کر لیا اور بوری کو خورجین میں رکھ کر لے چلا۔ جب وہ گاؤں سے نکلا دھوپ کافی تیز ہو گئی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ اس بار وہ نہر کے اس پار کسی ویرانے یا گاؤں میں چھوڑ آئے گا مگر نہر کے پل پر پہنچنے سے پہلے ہی فری و ہیل کے کتے فیل ہو گئے اور آدھا آدھا پیڈل ضائع جانے لگا۔ اس کا جی چاہا وہ اس بد بخت بلی کو جس کی وجہ سے اسے اتنی گرمی میں سفر کرنا پڑ رہا تھا نہر میں ڈبو مگر بڑی اماں سے کیا ہوا وعدہ اور کھائی ہوئی قسم آڑے آگئی اور اس نے ارادہ ترک کر دیا۔

اچانک اسے دور سے مال گاڑی آتی نظر آئی اس میں بہت سے کھلے منہ کی بوگیاں تھیں۔ اس نے سوچا کیوں نہ وہ اسے مال گاڑی کے حوالے کر دے۔ اس طرح اس کی قسم بھی نہیں ٹوٹے گی اور وہ مزید سفر کی صعوبت سے بھی بچ جائے گا۔ مال گاڑی قریب آئی تو اس نے تڑپتی ہلکی بوری کو اٹھا کر ایک ایسے کھلے ڈبے میں پھینک دیا جس میں بجری لدی ہوئی تھی اور جب تک وہ گھر پہنچا مال گاڑی کئی میل دور نکل گئی تھی۔

اگلی صبح جب مال گاڑی اس مقام سے جہاں سے کرم نے اسے بجری سے بھرے ڈبے میں پھینکا تھا، چپن کلومیٹر دور ایک قصبہ باقی ریلوے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ ریلوے کے ایک قلی رحمت دین کی نظر اس بوری پر پڑی جس میں کوئی چیز حرکت کرتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ قریب پہنچا تو گھٹے ہوئے گلے سے نکلتی کراہ جیسی میاؤں میاؤں سن کر چونک پڑا۔ فوراً سمجھ گیا کہ کسی سنگدل نے ایک بے زبان سے پیچھا چھڑانے کے لئے اسے گاڑی میں پھینک دیا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر بوری اٹھالی اور پلیٹ فارم پر لے جا کر اس کا منہ کھولا۔

اس کا خیال تھا کہ بوری کا منہ کھلتے ہی وہ اچھل کر باہر آ جائے گی اور شہر یا مسافر خانے کی طرف دوڑ جائے گی مگر وہ بے سدھ سی فرش پر پڑی رہی۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر ہلکی سی میاؤں کی اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ وہ مسافروں اور دکھوں کا بوجھ اٹھاتا رہا تھا۔ بھوک پیاس کی آوی کا پکا ہوا تھا، جان گیا کہ موت کا ظالم پنجہ اس کی گردن تک پہنچ گیا ہے۔ جلدی جلدی چائے والے کے پاس پہنچا اور پرچ میں دودھ ڈال کر لے آیا۔ دودھ کی خوشبو سے بلی کے نتھنوں میں حرکت ہوئی مگر وہ کوشش کے باوجود منہ اور آنکھیں نہ کھول سکی۔ مسافر جمع ہو گئے تھے۔ ایک بڑے میاں نے پانی کے چھٹے مارے۔ ایک نوجوان چائے والے سے چچ مانگ لایا۔ رحمت دین نے اس کا منہ کھولا، نوجوان نیاس کے منہ میں دودھ کا چچ ڈالا۔ بلی کا پتھر ہوتا بدن تھر تھر کا بننے لگا۔

”اس کی روح نکل رہی ہے۔“ ایک بولا

”نہیں زندگی واپس آرہی ہے۔“ دوسرے نے جواب دیا۔

موت اور زندگی میں بس ایک چھپ چھپ کا فاصلہ تھا دو چار چھپے اس کے حلق سے اترے تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور لوگوں کے ہجوم سے بے پرواہ ہو کر پرچ میں رکھا دودھ چائے لگی۔ چائے والا پیالی میں تھوڑا سا دودھ اور لے آیا جسے وہ دیکھتے ہی دیکھتے چاٹ گئی۔ پھر اپنے ارد گرد کھڑے محسنوں اور تماشاخیوں کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک ایسے لہجے میں لفظ میاؤں ادا کیا جس کے سامنے سینکڑوں لفظ تھے۔ اس ایک لفظ میں بہت سا مفہوم چھپا ہوا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح نالہ لے کا پابند نہیں ہوتا اسی طرح اظہار بھی لفظوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ جذبات کا اظہار تو وہ بھی کر لیتے ہیں جو گونگے اور قوت گویائی سے محروم ہوتے ہیں۔ اس کے پاس تو زبان تھی اور ایک لفظ میاؤں بھی تھا جس سے وہ موقع محل کے مطابق ہر قسم کے مطالب ادا کر سکتی تھی۔ کچھ دیر تک پلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر دوڑتی ہوئی اسٹیشن سے باہر نکل گئی۔

اب وہ دن بھر بستیوں میں ماری ماری پھرتی۔ ہوٹلوں، قصابوں کی دکانوں اور گھروں کے اندر یا باہر سے کھانے پینے کے لئے کچھ نہ کچھ مل جاتا۔ اپنی ہم جنسوں سے لڑتی۔۔۔۔۔ پیچھا کرنے والے کتوں سے بچتی بچاتی اور شریر لڑکوں سے مار کھاتی وہ ایک سے دوسری بستی کی طرف دوڑتی رہتی۔

بعض ایسی بستیاں تھیں جہاں کھانے پینے کی چیزوں کی کمی نہ تھی پناہ بھی مل جاتی مگر اندر کی بے کلی اسے کہیں ٹکنے نہ دیتی۔ ہر آبادی میں گھوم پھر کر اپنا گھر تلاش کرتی اسے لگتا بھی جب وہ کوئی دیوار پھاند کر کسی دوسرے آگن میں اترے گی تو اس کا کوئی بلوٹکڑا اس کے انتظار میں میاؤں میاؤں کر رہا ہوگا۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ جس گاؤں گھر اور آگن کی تلاش میں تھی وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ جب

تلاش بسیار کے باوجود جانا پہچانا گھر لوگ اور بچے کہیں دکھائی نہ دیتے تو وہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگتی۔ مگر جب کبھی ریل گاڑی آ جاتی وہ بھاگ کر قریبی کھیتوں یا آبادی میں پناہ لیتی جیسے اسے ڈر ہو کہ ریل گاڑی اسے بوری میں بند کر کے پھر اپنے کہیں دور لے جائے گی۔

گھر میں بڑی اماں کے سوا تقریباً سب ہی اسے بھول چکے تھے یا بھول جانا چاہتے تھے۔ ویسے بھی اب اس کی جگہ اس کی بلوگری مانو نے لے لی تھی۔ کھاتا پیتا گھر انہما دونوں بیٹے مل ایسٹ میں تھے خوب کماتے اور پیسے بھیجتے رہتے تھے۔ زمینداری کا سارا کام بڑے میاں نے ٹھیکے پر دے رکھا تھا اور خود چوپال میں پٹنگ پر لیٹے حقہ گڑ گڑاتے اور کامی کاریوں سے پاؤں دبواتے رہتے تھے۔ تقریباً ہر روز ہی گھر میں گوشت آتا تھا جسے صاف کرتے وقت مانو کا حصہ خود بخود الگ ہو جاتا تھا۔ چند ہی ماہ میں وہ خوب موٹی تازی ہو گئی تھی۔ شانو سے اس کی اب بھی دوستی تھی۔ بڑی اماں شانو اور مانو سے ایک دوسری کا حال احوال پوچھتی رہتی تھیں۔

یوں تو گھر والوں نے مانو کی ماں کے چلے جانے سے سکھ کا سانس لیا تھا مگر گھر میں جب بھی کوئی بیمار پڑتا یا کوئی نقصان ہو جاتا تو بڑی اماں کہتیں ”یہ سب اس معصوم کو ستانے کا نتیجہ ہے۔“

خاص طور پر جب بری خبر یا نقصان کا کوئی تعلق چھوٹی بہو یا اس کے میکے سے ہوتا تو بڑی اماں کو یقین ہو جاتا کہ یہ سب اس کو گھر بدر کرنے کا نتیجہ ہے۔ بیٹوں کی طرف سے چٹھی آنے میں دیر ہو جاتی یا ان کو گھر آنے کے لئے چھٹی نہ ملتی تو بڑی اماں کو ہول آنے لگتا۔ بڑے کو گھر آئے دو سال ہو چلے تھے چھوٹا کچھ عرصہ پہلے چکر لگا گیا تھا مگر بڑی اماں نے اس کے جاتے ہی اس کی واپسی کا حساب کرنا شروع کر دیا تھا۔

چھوٹی بہو کا پاؤں بھاری تھا بڑی اماں منہ سے تو کچھ نہ کہتی تھی لیکن انہیں اس کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ وہ ہر نماز کے بعد اپنے سارے کنبے کی سلامتی کی دعائیں مانگتیں اور ہر وقت صدقہ خیرات کرتی رہتیں۔

چھوٹی بہو پہلے تو اسے بڑی اماں کا وہم سمجھتیں مگر جب ان کے میکے سے مسلسل بری خبریں آنے لگیں کبھی کوئی بیمار پڑ جاتا کبھی کسی کا کوئی مویشی مر جاتا کبھی چوری ہو جاتی تو ان کا دل بھی انجانے وسوسوں میں گھر گیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا اگر وہ واپس آ سکتی ہوتی تو کب کی آچکی ہوتی۔ پتہ نہیں ریل گاڑی اسے کہاں لے گئی تھی۔ کیا معلوم زندہ بھی تھی یا نہیں؟

یہ اگلے موسم گرما کے ابتدائی دنوں کا ذکر ہے اس بار خلاف معمول بارشیں بہت ہو رہی تھیں ڈالہ باری سے فصلوں کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ رات رات بھر بادل گر جتے، بجلی گونجتی اور ہر بار لگتا جیسے ابھی کہیں قریب ہی گری ہے۔ مسلسل بارش اور ڈالہ باری سے جاتا

ہوا جاڑا لوٹ آیا تھا اور لوگوں نے دوبارہ گرم کپڑے پہننا شروع کر دیئے تھے۔

یہ ایسی ہی ایک رات تھی آنگن میں اولوں کے ڈھیر لگے تھے۔ تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے درختوں کے پتے اور ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں اور بادلوں سے ڈھکے آسمان سے گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ پسار اور برآمدے کا درمیانی دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر سب سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک برآمدے سے انسانی آوازوں سے ملتی جلتی بلیوں کے غرانے اور رونے کی خوفناک آوازیں سنائی دیں۔ جس سے ایک عجیب سے خوف نے سارے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

”آج پھر مانو باہر رہ گئی ہے۔“ بڑی بہو نے کہا ”پتہ نہیں کس سے لڑ رہی ہے؟“

”اماں لو ہاراں کا بلا ہوگا“ شانو نے کہا۔

”کیا پتہ مانو کی ماں ہو“ بڑی اماں بستر میں لیٹے لیٹے بڑبڑائیں۔ وہ اب اس کی واپسی کی آس لگائے بیٹھی تھیں۔

”وہ بے چاری اب کہاں؟“ بڑی بہو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

بلیاں برابر غراتی اور روتی رہیں۔ شانو نے کھڑکی کا پٹ کھول کر دیکھا۔ اندھیرے میں اسے چار چمکتی آنکھیں نظر آئیں مگر پھر بجلی گونجی تو اس نے اس کی چمک میں دیکھا رسوئی کے دروازے کے پاس مانو اور ایک دوسری موٹی سی بلی آمنے سامنے بیٹھی تھیں اور شیر خوار انسانی بچوں سے ملتی جلتی آوازوں میں رو رہی تھیں۔

”دادی اماں۔۔۔۔۔ یہ تو وہی ہے۔ وہ آگنی ہے۔“ شانو خوشی سے چلائی۔

بڑی اماں بستر سے نکل کر گرتی پڑتی کھڑکی کے پاس آگئیں۔ وہ خلاف توقع خاموش تھیں اور ٹکڑا ٹکڑا اندھیرے میں دیکھے جا رہی تھیں۔ اسی لمحے چھوٹی بہو ایک ہاتھ میں لائین اور دوسرے ہاتھ میں دودھ کا کٹورا لے کر برآمدے میں پہنچیں۔ اچانک بڑی اماں کے منہ سے ایک عجیب و غریب سی چیخ نکلی جو انسانی آواز سے بالکل مختلف تھی۔



چیزیں اپنے تعلق سے پہچانی جاتی ہیں

بڑی نہر کے پل پر پہنچ کر اس کے میکے گاؤں کا گھوڑسوار واپس چلا گیا۔ اس کا سسرالی گاؤں اب ڈیڑھ دو کوس کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں کی مسجد کے مینار چودھریوں کے چوہارے اور آم کے پیڑ صاف نظر آنے لگے تھے۔

نہر سے ایک چھوٹا سا راج بہا سیدھا گاؤں جاتا تھا۔ اس نے پانی سے لبالب نہر کو دیکھا اسے لگا وہ خود بھی اسی کی طرح خوشی سے لبالب ہے اپنی اب تک کی زندگی میں یہ دوسرا موقع تھا جب اس نے اس خوشی محسوس کی تھی اور اسے اپنی اہمیت کا احساس ہوا تھا۔ پہلا موقع وہ تھا جب وہ پہلی بار ماں بنی تھی اور اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ پداری نظام کے معاشرے میں ہر عورت کو بیٹے کی پیدائش احساس تحفظ عطا کرتی ہے۔ اسے بھی ایسا لگا تھا جیسے ترازو کا وہ پلڑا جسے اس کی ساس اپنے بیٹے سمیت اٹھنے نہیں دیتی تھی ایک دم برابر ہو گیا ہو۔ مگر اب اسے ایک دوسری طرح کی خوشی اور فخر کا احساس ہو رہا تھا جیسے وہ گدھی یا گائے کی جون سے نکل کر آدمی کی جون میں آ گئی ہو۔

راج بہا کے دونوں جانب ہری بھری فصلیں اور پھلوں سے لدے اشجار تھے جو سہ پہر کی دھوپ میں بہت خوبصورت لگ رہے تھے یا شاید آج اسے ہر چیز خوبصورت لگ رہی تھی۔ اسے وہ دن یاد آنے لگا جب کئی سال پہلے وہ بیاہ کر پہلی بار اس گاؤں میں آئی تھی۔ ایسی ہی رات تھی۔ ہاں بارش ہو جانے کی وجہ سے اس روز اتنا گرد و غبار نہیں اڑتا تھا اسے یاد آیا اس روز نہر بھی سوکھی پڑی تھی۔ البتہ آنسوؤں کی ایک نہر اس کے اندر ضرور بہہ رہی تھی جو آنکھوں کے موگھوں سے رس نہیں پار رہی تھی۔ اسے ساری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس دن کی ہر بات اس کے دل پر نقش تھی۔ لاری سے اتر کر انہوں نے تانگہ کرائے پر لیا تھا۔ دلہا، دلہن اور جہیز سمیت ساری پوری بارات ایک ہی تانگے میں سا گئی تھی۔ اس کا خیال تھا اگر میکے گاؤں میں اس کی رخصتی دھوم دھام سے نہیں ہوئی تھی تو سسرالی گاؤں میں اس کا استقبال ضرور اچھے طریقے سے ہوگا۔ مگر جلد ہی اسے پتہ چل گیا کہ کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ محض ایک کنیا سے دوسری میں منتقل ہوئی تھی۔ ویسا ہی چھوٹا سا کچے پکے مکانوں پر مشتمل ایک گاؤں۔ ویسا ہی بڑا سا تالاب جس نے آدھے سے زیادہ گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اسی طرح کا گاؤں سے ہٹ کر ایک جھونپڑی نما مکان جس کی دیواریں مفلسی کی اینٹوں اور محرومی کے گارے سے چنی گئی تھیں اور جس کی چھت عسرت کی کڑیوں پر کھڑی تھی۔

تائنگہ گاؤں سے باہر ہی رک گیا تھا کہ گلیوں میں بارش کا پانی، گوبر اور کیچڑ تھا۔ براتیوں نے اس کے جبین کا مختصر سا سامان اٹھالیا تھا۔ کپڑوں کی گٹھڑی اس نے خود سر پر اٹھالی اور چند چھوٹی چھوٹی چیزوں کی پونلی ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ کیچڑ سے لت پت گلیوں میں سنبھل سنبھل کر چلتی بڑی مشکل سے اس گھر تک پہنچی تھی جواب اس کا اپنا گھر تھا۔ گلیوں میں لوگ آ جا رہے تھے مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی البتہ چند ایک راگیروں نے اس کے لئے راستہ ضرور چھوڑا تھا یا پھر موچیوں کی دکان کے سامنے اکڑوں بیٹھے کن کٹے کتے نے اس پر غرانے کے لئے منہ کھولا تھا مگر پھر اس کے شناسا ہمراہیوں کو دیکھ کر وہ اپنی غراہٹ پی گیا تھا۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ اس کی ساس نے اس کا استقبال اس طرح کیا تھا جیسے اس کا بیٹا بنی گائے یا گدھی خریدا یا ہو اس کی پہلی بیوی دولڑکیاں چھوڑ کر مر گئی تھی یا شاید شوہر نے اسے پیٹ پیٹ کر یا ساس نے طعنے دے دے کر مار ڈالا تھا۔ ساس نے البتہ اس کے سر سے گٹھڑی اتار کر ایک طرف رکھ دی حالانکہ وہ جانتی ہوگی کہ اس میں کوئی قیمتی چیز نہیں تھی پھر وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر چار پائی تک لے گئی تھی جس پر کالی چٹی ڈبیوں والا نیا کھیس بچھا ہوا تھا۔ اسے اس کھیس اور اپنے جیون میں بڑی مشابہت نظر آئی وہ اسکے بعد بھی اسے سنبھال سنبھال کر رکھتی رہی کہیں اس کا کالا رنگ اتر کر سفیدی کو سیاہی مائل نہ کر دے۔ ساس اسے چار پائی پر بٹھا کر بیٹے اور براتیوں کی آؤ بھگت میں اسے بھول گئی تھی۔ اسے پانی بھی مانگ کر پینا پڑا تھا۔

مکلاوے کے بعد وہ صرف دو بار اپنے شوہر کے ہمراہ میکے گئی تھی۔ ایک بار جب اس کا بوڑھا باپ فوت ہو گیا تھا اور دوسری بار جب اس کے سوتیلے بھائی کا بیاہ ہوا تھا۔ اس کے بعد سوتیلی ماں اور بہن بھائیوں نے کبھی اس کی خبر لی نہ ہی اسے کسی خوش غمی کے موقع پر یاد کیا۔ وہ بھی کبھی پلٹ کر وہاں نہیں گئی۔ کس کے پاس جاتی؟

سوتیلی ماں اور بہن بھائیوں کو اس سے ملنے کا کوئی ارمان نہیں تھا۔ وہ تو اس کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کے موقع پر بھی ملنے یا مبارکباد دینے نہیں آئے تھے۔ ان کے اس سلوک کی وجہ سے اس کا دل دکھی رہتا تھا مگر اس نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ جب تک میکے گھر سے کوئی اسے ملنے نہیں آتا یا اسے خوشی غمی کی کسی تقریب میں شرکت کے لئے سندیسہ نہیں بھیجا جاتا وہ بھی ان سے ملنے نہیں جائے گی۔

اس کا شوہر اس کے باپ کی طرح غریب اور معمولی شخص تھا۔ نمبردار کے ہاں ملازم تھا۔ ان کی چلمیں بھرتا، مویشیوں کو چارہ ڈالتا اور ان کے گھوڑوں کی خدمت کرتا۔ وہ بڑی مشکل کی زندگی گزار رہے تھے مگر مفلسی تو اس کی جڑواں بہن تھی۔ وہ ایسی زندگی کی عادی تھی۔ اس لئے اسے کوئی شکایت نہیں تھی۔ خدا نے اسے صحت مند اولاد دی تھی اور وہ خوش اور مطمئن تھی۔ البتہ بوڑھی ساس جب اسے میکے گھر کے طعنے دیتی کہ اس کا آگاہ چچا نہیں ہے اور کبھی کسی نے بھول کر بھی اس کی خبر نہیں لی تو اسے بہت برا لگتا اور وہ اندر ہی اندر

آوی پر چڑھی رہتی۔ اس کا شو ہر اب تک ماں سے ڈرتا تھا اور جب بھی گھر میں جھگڑا ہو جاتا تھا وہ اسے ہی پیٹ ڈالتا تھا خواہ اس کا ذرا سا قصور بھی نہ ہو۔

پھر میکہ گھر ہی نہیں میکہ گاؤں بھی اس کے لئے گالی بن گیا اور بڑھیا اسے ستانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی۔ اس کا میکہ گاؤں کچھ اچھی شہرت نہیں رکھتا تھا۔ اسے یاد تھا کہ زمینداروں کے دو گروہ پشت پاشت سے آپس میں موت کی ہولی کھیلتے آئے تھے۔ اس نے بچپن میں بھی انتقام در انتقام کے سلسلوں میں کئی لڑائیاں دیکھی اور سنی تھیں مگر اب اس گاؤں کے لوگ باہمی لڑائیوں کے علاوہ چوریوں اور ڈاکوؤں میں ملوث ہو گئے تھے۔ کئی ایک اشتہاری ملزموں کی پولیس کو تلاش رہتی تھی اور وہ اکثر چھاپے مارتی رہتی تھی۔

اس کے سسرالی گاؤں کی ایک عورت اس علاقے میں بیانی ہوئی تھی وہ سال چھ مہینے میں جب بھی آتی اس سے نئی نئی خوریزیوں اور حادثوں کے قصے سننے میں آتے۔ اور اب تو کچھ عرصہ سے اس کے میکہ گاؤں کے چوروں اور ڈاکوؤں اور قتل کے مقدموں میں ملوث اشتہاری ملزموں کے پولیس مقابلوں کی خبریں ہر گاؤں میں پہنچنے لگی تھیں۔ جب بھی ایسی کوئی خبر آتی اس کی ساس اسے جلانے کے لئے بار بار اس کے میکہ گاؤں کا ذکر اس طرح کرتی جیسے ان سب باتوں کی ذمہ دار وہی ہو۔ بڑھیا جب زیادہ تنگ کرتی تو اس سے نہ رہا جاتا۔ وہ جواب دیتی۔ ”اگر وہ گاؤں برا ہے تو وہاں کے لوگ ایسے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور؟“

”ہاں تمہارا تو کچھ قصور نہیں اس گاؤں کی مٹی ہی ایسی ہے وہاں کوئی اچھا انسان پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔“

”کیوں پیدا نہیں ہو سکتا؟“ وہ جل بھن کر جواب دیتی۔ پھر اسے اپنے گاؤں کے نیک اور اچھے معصوم لوگ یاد آتے۔ اپنا باپ یاد آتا جس نے زندگی بھر لوگوں کی خدمت کی تھی اور جو ہر کسی کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھ کر بے چین ہو جاتا تھا اور ”سب کا بھلا“ جس کا تکیہ کلام بن گیا تھا۔

کئی بار وہ خود کو سمجھاتی کہ اس کے شوہر کا گاؤں ہی اب اس کا اپنا گاؤں تھا اور اسے میکہ گاؤں کے طعنوں مہنوں سے چڑنا نہیں چاہیے بلکہ اسے بھول جانا چاہیے مگر میکہ گاؤں اس کے دل و دماغ سے نہ نکلتا تھا وہ جیسا بھی تھا اسے بے حد عزیز تھا وہاں نہیں جاتی تھی مگر وہ اس کے اندر آباد رہتا تھا وہ اس کے سپنے دیکھتی اس کی گلیوں میں گھومتی اس کے خراس اور رہٹ چلنے کی آوازیں سنتی۔ بچپن کی ہم جولیوں کے ساتھ اس کے باغوں میں لکڑی مٹی کھیلتی۔ اس کے پرندے اس کے خیالوں میں پھڑ پھڑاتے۔ اس کے کھیت اور فصلیں اس کی یادوں کے افق پر لہلہاتی ہیں اس کا نام لیتے ہی اس کے منہ میں مٹھاس سی گھل جاتی۔

بیٹیوں کو روٹی ضرور بھجواتے ہیں۔ اسے سنبھال کہتے ہیں۔ بارات میں تمہارے گاؤں کا ملک نواز بھی ہے اس نے تمہیں یہ روٹی بھیجی ہے۔“

”تو کیا وہ مجھے جانتا ہے اسے معلوم ہے کیا؟“

”اس نے تا جانا کی کو بلا کر پوچھا تھا اسی سے پتہ چلا کہ اس کے گاؤں کی ایک لڑکی یہاں بیاہی ہوئی ہے۔ یہ روپے بھی ساتھ ہیں۔“ میراثی نے پانچ روپے کا نوٹ اور کھانا اسے تھماتے ہوئے بتایا۔

خوشی سے اس کا دل کھل اٹھا۔ فخر کے احساس سے اسے اپنا قد بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اس کھانے کو طشتریوں میں سجا کر گھر کے باہر رکھ دے اور آنے جانے والوں کو دکھا دکھا کر کہے دیکھو یہ کھانا میرے میکے گاؤں کے باراتی نے مجھے بھیجا ہے۔

ڈولی نکلی اور بارات واپس جانے لگی تو وہ ہمت کر کے ملک نواز کے پاس پہنچ گئی اور اسے سلام کیا۔

”میرا نام بی بی ہے میں آپ کے گاؤں کی ہوں، میکے مسلی کی بیٹی“

”جیتی رہو“

”آپ نے مجھے یاد رکھا آپ کی بڑی مہربانی“

”وہ تو میرا فرض تھا اللہ تمہیں خوش رکھے۔“

ملک نواز نے اس کے گھر شوہر اور بچوں کے بارے میں بھی پوچھا اور اسے دعا دے کر چلا گیا اسے لگا جیسے وہ کچھ عرصہ پہلے مر گئی تھی اور اب دوبارہ جی اٹھی ہے۔

میکے کی خوشگوار یادوں نے اسے کئی روز تک بے چین کئے رکھا اور اپنے گاؤں جانا اور اپنے مرحوم باپ کی نشانی اپنا آبائی گاؤں دیکھنا چاہتی تھی مگر شوہر اور ساس نے اسے جانے کی اجازت نہ دی۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ چند روز پہلے جب وہ ایک مدت کے بعد اپنے چھوٹے بیٹے کے ہمراہ اپنے میکے گاؤں کے لئے روانہ ہو رہی تھی تو اس کی ساس نے بہت باتیں کی بنائی تھیں۔ اگرچہ وہ اپنے سوتیلے بھائی کے اکلوتے بچے کی تعزیت کے لئے جارہی تھی مگر بڑھیا اسے ابھی سے خالی ہاتھ لوٹنے کے طعنے دے رہی تھی۔ اس کا شوہر عام طور پر لین دین کی ایسی باتوں کو اہمیت نہ دیتا تھا مگر جب سے نمبردار کی گھوڑی جس کے چارے پانی پر وہ مامور تھا، چوری ہو گئی تھی اور اسے نوکری سے جواب مل گیا تھا وہ بیکار رہ رہ کر ضدی اور

چڑچڑاہو گیا تھا۔ اس نے بھی طعنوں مہنوں میں ماں کا ساتھ دیا اور اسے ریل گاڑی یا بس کا کرایہ تک نہ دیا تھا۔ ماں بیٹا بیس میل کا سفر پیدل طے کر کے پہنچے تھے۔

سوتیلی ماں اور بہن بھائیوں نے اس کی آمد پر کسی خاص خوشی یا تشکر کا اظہار نہیں کیا تھا مگر اتنے عرصے کے بعد اس کا ایسے موقع پر آنا انہیں برا بھی نہیں لگا تھا۔ اس کے جی میں لالچ بالکل نہیں تھا اور پھر وہ افسوس کے لئے آئی تھی مگر وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتی تھی کہ اسے اور اس کے لڑکے کو میکے گھر سے کم از کم ایک ایک جوڑا کپڑوں کا ضرور مل جائے ورنہ وہ ساس اور شوہر کے طعنے سن کر دکھی ہوتی رہے گی۔ اس نے سوچا تک نہ تھا کہ میکے گاؤں جانا اتنا مبارک اور خوشگوار ثابت ہوگا۔

ایک شام وہ اپنی سوتیلی بہن کے ہمراہ گلی سے گزر رہی تھی کہ چاچا ولولہ لٹھی کے سہارے چلتا ہوا قریب سے گزرا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا۔ چاچا ولو کھاتا پیتا جاٹ تھا۔ کئی مربع زمین اس کی ملکیت تھی مگر وہ زندگی بھر چوریوں اور اورڈا کوں میں ملوث رہا تھا۔ کئی بار جیل گیا تھا۔ اب کمزور اور بوڑھا ہو گیا تھا۔ مگر اس کے بیٹے اور بھائی بھتیجے پوری طرح اس کے نقش قدم پر چل رہے تھے چوریاں اور ڈاکے ان کی ضرورت اور مجبوری نہیں مشغلہ تھے۔ رہزنی، رسہ گیری اور ڈکیتی میں ان کی دور دور تک مارتھی۔ چاچا ولو نے اسے نہیں پہچانا اس کی بہن نے اس کا تعارف کرایا تو اسے یاد آ گیا۔ اس کا مرحوم باپ کچھ عرصہ تک ان کے مویشی چراتا رہا تھا وہ بھی کبھی کبھی گندم صاف کرنے ماں کے ساتھ ان کی حویلی میں جایا کرتی تھی۔ چاچا ولو نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی پھر بولا ”کہاں بیٹا ہی ہوئی ہو؟“

اس نے اپنے سرالی گاؤں کا نام بتایا تو چاچا ولو چونک سا گیا۔ کچھ دیر پریشان سا کھڑا لٹھی کے سرے پر لگی پیتل کی شام کو مسلتا رہا پھر بولا ”کب سے وہاں ہو؟“

”میرے بیاہ کو تو دس بارہ سال ہو گئے ہیں چاچا“

چاچا ولو نے کچھ دیر سوچا پھر کہنے لگا۔ ”بیٹی سرال واپس جانے سے پہلے ہمارے ہاں ضرور آنا ایک ضروری کام ہے۔“ اس نے اگلے روز آنے کا وعدہ کر لیا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا چاچا ولو کو اس سے کیا ضروری کام ہو سکتا تھا اور وہ اس کے سرالی گاؤں کا نام سن کر چونک سا کیوں گیا تھا۔

اگلے روز وہ ماں اور بھائی کے ساتھ چاچا ولو کی حویلی پہنچی۔ انہیں ڈیوڑھی میں بٹھا دیا گیا اور لسی پانی سے تواضع کی گئی۔ گھر کے اندر کنبے کے بہت سے افراد جمع تھے اور اندر سے کسی مسئلے پر بحث کی آوازیں آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد چاچا ولو کی چھوٹی بہو کپڑوں

کا جوڑا چاولوں کا تھا اور پانچ روپے کا نوٹ لے کر آئی اور سب کچھ اس کی جھولی میں ڈال کر چلی گئی۔ وہ اٹھ کر واپس آنے لگے ایک نوکرانی نے آکر کہا ”ابھی تم لوگ بیٹھو اور چودھری صاحب کا انتظار کرو۔“

گھر کے اندر آوازوں کا شور اب اونچا ہو گیا تھا ایسے لگتا تھا جیسے کوئی نہایت نزاعی معاملہ زیر بحث ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا مگر بار بار کسی گھوڑی کا ذکر ہو رہا تھا۔ وہ چونکی کہیں وہ نمبردار کی گھوڑی کا ذکر تو نہیں تھا جس کے چوری ہو جانے پر اس کے شوہر کو نوکری سے جواب مل گیا تھا اور جس کی بازیابی کے لئے اس کے سسرالی گاؤں کے نمبردار نے بھاری رقم کے انعام کا اعلان کر رکھا تھا۔ یہ تین چار ماہ پہلے کی بات تھی جب گرمیوں کی ایک رات کو چند مسلح گھوڑ سوار ڈاکو اس کے سسرالی گاؤں میں داخل ہوئے تھے۔ نمبردار کی گھوڑی جسے رانی کے نام سے پکارا جاتا تھا اور جو اس کی اکلوتی بیٹی بانو کو بہت عزیز تھی چوری کر کے لے گئے۔ رانی کی خوبصورتی اور خوبیوں کا دور دور تک شہرہ تھا اور اعلیٰ نسل کی گھوڑیوں اور گھوڑوں کے شوقین زمیندار اسے خریدنے کے لئے بھاری رقوم کی پیشکش کر چکے تھے۔ مگر نمبردار اسے کسی قیمت پر بیچنے پر رضامند نہیں ہوا تھا وہ اس سے بانو ہی کی طرح محبت کرتا تھا۔ گاؤں کے لوگ بھی خیریت دریافت کرنے اور دعا دینے کے لئے بانو اور رانی کا نام ایک ساتھ لیتے تھے۔ رانی کی علاقے میں اس قدر دھوم تھی کہ بانو کہا کرتی اسے رانی نے بانو رانی بنا دیا ہے ورنہ وہ محض بانو تھی۔ جب ڈاکوؤں نے رانی کے پاؤں کا سنگل کھولا بانو قریب ہی چھت پر سو رہی تھی۔ اس کی آنکھ اس وقت کھلی تھی جب حویلی سے نکلتے ہوئے رانی زور زور سے ہنپنائی تھی اور اس سے پیشتر کہ بانو کا شور سن کر جاگے اور بوکھلائے ہوئے لوگ ڈاکوؤں کے گرد گھیر ڈال لیتے یا ان کا تعاقب کرتے وہ ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں تیز رفتار گھوڑوں پر سوار غائب ہو چکے تھے۔ کھوجیوں نے کچی سڑک تک کھرا نکالا تھا مگر پھر اس کے بعد کچھ پتہ نہ چلا اگر بارش نہ ہو جاتی تو شاید اس کا کچھ سراغ مل جاتا مگر اب سارے نشانات مٹ چکے تھے۔

اتنی خوبصورت عزیز اور قیمتی گھوڑی چوری ہو جانے پر نمبردار اور اس کی بیٹی ہی نہیں پورا گاؤں اداس تھا۔ دور دور سے لوگ افسوس کرنے آئے۔ بانو نے کئی روز تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ پولیس میں رپورٹ کرائی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا اور اب نمبردار نے ہر طرف سے مایوس ہو کر مخبری یا نشانہ بنی کرنے والے کے لئے بھاری رقم کے انعام کا اعلان کر رکھا تھا۔

اس کا اندازہ درست نکلا۔ یہ اسی گھوڑی کا ذکر ہو رہا تھا چاچا و لو اس کے پاس آیا اور بولا۔

”بیٹی! لڑکے تمہارے سسرالی گاؤں کی گھوڑی کی شہرت سن کر اسے بھگا لائے تھے۔ واقعی بہت خوبصورت اور قیمتی جانور ہے۔ لیکن اگر انہیں معلوم ہوتا کہ وہاں اپنے گاؤں کی لڑکی بیانی ہوئی ہے تو وہ کبھی اس طرف کا رخ نہ کرتے۔ یہ سب لاعلمی میں ہوا۔ اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم گھوڑی واپس کر دیں گے۔“

چاچا لولو کا منجھلا بیٹا جس کی بڑی بڑی خوفناک مونچھیں تھیں، قریب آیا اور بولا ”اگر تم چاہو تو یہ گھوڑی تم خود واپس لے جاسکتی ہو۔“
”میں.....؟“

”ہاں“ چاچا لولو نے کہا ”کوئی آدمی تمہیں وہاں تک چھوڑ آئے گا۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہوگی۔“ اس کی سوتیلی ماں نے کہا ”نمبردار اور اس کی بیٹی بہت خوش ہوں گے۔ اس کی زندگی سنور جائے گی۔“

”میں ان سے کہوں گی“ وہ بولی ”پولیس رپورٹ واپس لے لیں وہ ضرور مان جائیں گے۔“

”پولیس سے ہم نمٹ لیں گے۔“ چاچا لولو کے بیٹے نے کہا۔

”ہاں اس کی تم فکر نہ کرو۔“ چاچا لولو بولا ”ہم تو تم سے شرمندہ ہیں بیٹی“

وہ چونکی۔

ایک تیز رفتار موٹر سائیکل گرداڑاتی شور مچاتی قریب آرہی تھی۔ وہ لگام کھینچ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ موٹر سائیکل سوار قریب آ کر رک گیا وہ ماسٹر گلزار تھا۔

کہنے لگا ”مجھے تو یہ نمبردار کی گھوڑی رانی معلوم ہوتی ہے۔“

”ہاں وہی ہے۔“ اس نے چمک کر کہا۔

”کہاں سے ملی؟“

”میرے میکے گاؤں کے ڈاکو لے گئے تھے۔“ اس نے ایسے انداز میں کہا جیسے ڈاکو ہونا بڑے فخر کی بات ہے۔

”پھر واپس کیسے کر دی؟“

”جب انہیں پتہ چلا کہ اس گاؤں میں میں بیابانی ہوئی ہوں ان کے گاؤں کی بیٹی تو انہوں نے واپس کر دی۔“

”کمال ہے“ ماسٹر گلزار نے حیرت اور خوشی سے کہا۔ ”ان چوروں اور ڈاکوؤں کے بھی نرالے اصول ہوتے ہیں۔ اچھا میں گاؤں جا کر

اطلاع کرتا ہوں۔“

وہ چاہتی تو ماسٹر گلزار کے پیچھے پیچھے فوراً ہی گاؤں پہنچ سکتی تھی اس کا بیٹا بھی رفتار بڑھانے کے لئے اصرار کر رہا تھا خود رانی اپنے گاؤں کے قریب آ کر بے قرار ہو رہی تھی اور اڑ کر پہنچ جانا چاہتی تھی مگر اس نے جان بوجھ کر رفتار اور کم کر دی اور وہ جانتی تھی کہ گاؤں میں رانی کی بازیابی کی خبر پہنچتے ہی سارا گاؤں اسے دیکھنے اور اس کا استقبال کرنے کے لئے جمع ہو جائے گا۔ وہ خوشی کی ان ساعتوں کو

طول دینا چاہتی تھی۔

گاؤں کے باہر لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اسے لگا وہ خود رانی ہے اور ہاتھی پر سوار ہو کر ہودج میں بیٹھی اپنی راجدھانی میں لوٹ رہی ہے۔ لیکن اسی لمحے جب خوشی کی نہر کناروں سے چھلک رہی تھی وہ پہلا دن اسے پھر یاد آیا جب وہ نئی نویلی دلہن کے روپ میں تانگے سے اتر کر اس گاؤں میں داخل ہوئی تھی اور اگرچہ اسے اطمینان تھا کہ میکے گاؤں نے اس کا سرفخر سے بلند کر دیا ہے مگر وہ یہ سوچ کر اداس ہو گئی کہ یہ سب رانی کی وجہ سے ہو رہا تھا اور ایک گھوڑی اس سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ ورنہ وہ تو آج بھی وہی تھی۔ چیزیں اپنے تعلق سے پہچانی جاتی ہیں۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ کوئی ان کی اپنی شناخت نہیں کرتا۔ اس خیال کے آتے ہی اسے لگا جیسے کہیں دور کسی ہیڈورکس پر آہنی دروازے گرا کر نہر کو بند کر دیا گیا ہو اور اس میں ہر لمحہ پانی کی سطح کم ہوتی جا رہی ہو۔

جب بانو نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا تو پانی کا آخری ریلا موگوں سے گزر چکا تھا اور دور دور تک کچھڑلی ریت ہی ریت تھی۔



دارالسلطنت کے باہر راستے کے دونوں جانب لوگوں کا جم غفیر دیکھا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا کہ رعایا اس سے اس قدر خوش تھی اور اس کے استقبال کے لئے ہزاروں لوگ جمع ہو گئے تھے مگر وزیر نے یہ انکشاف کر کے بادشاہ کو حیران اور پریشان کر دیا کہ اس روز نور بانو دارالسلطنت میں آنے والی تھی اور لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اٹھ پڑے تھے۔

بادشاہ کے لئے اس سے بڑا اور کیا صدمہ ہو سکتا تھا کہ لوگ اس کی بجائے ایک معمولی گانے والی کے استقبال کے لئے جمع ہوں۔ بادشاہ کو نور بانو کا وجود خطرے کی علامت نظر آنے لگا۔ وزیر نے جلتی پر تیل ڈالا۔

”جہاں پناہ نے نہایت دانائی اور دور اندیشی کی بات کی ہے۔ ہوا سے زیادہ سبک اور لطیف اور پانی سے زیادہ نرم اور ہر قالب میں ڈھل جانے والی کوئی چیز نہیں ہوتی مگر جب ہوا زور پکڑ جائے تو آندھی اور بہت سا پانی جمع ہو جائے تو سیلاب بن جاتا ہے۔“

”نور بانو کو کل دربار میں حاضر کیا جائے ہم اس کے فن کی داد دینا چاہتے ہیں۔“ بادشاہ نے معنی خیز نگاہوں سے وزیر کی طرف دیکھا۔

”جو حکم عالی جاہ“

”اور ایک صاحب ذوق بھی۔۔۔۔۔ جو اس کے فن کا قدردان ہو۔“

”غلام سمجھ گیا۔ حکم کی تعمیل ہوگی۔“ وزیر بات دبیر نے جواب دیا۔

اگلے روز بانو کو اس کے سازندوں سمیت دربار میں پیش کر دیا گیا۔ اس محفل موسیقی میں بہت سے اہل ذوق مہمانوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

نور بانو نغمہ سرا ہوئی تو بادشاہ پر محویت کا عالم طاری ہو گیا اور وہ آنکھیں موند کر نہایت انہماک سے نور بانو کی آواز اور موسیقی کے سحر میں کھو گیا۔ درباری اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے جھوم رہے تھے مگر بادشاہ کی موجودگی میں خبر برو مغنیہ کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھنے کی کسی کو جرات نہ تھی۔ تلواریں اور بھالے لئے جاں نثار پہریدار پہریداروں پر پتھر کے مجسموں کا گمان ہوتا تھا۔ کنیزوں کے ہاتھوں میں مورچھل بھی سازوں کے آہنگ اور تال پر حرکت کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے مغنیہ کی ہوشربا آواز نے ماحول پر جادو کر پھونک دیا ہو دربار میں سوائے ایک مہمان کے کوئی بھی پوری طرح ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ یہ مہمان پہلی بار شاہی دربار میں شریک ہوا تھا۔ موسیقی کا نہایت اچھا ذوق رکھتا اور نور بانو کے فن کا پرستار تھا۔

فن فوری داد کا طلب گار ہوتا ہے۔ اونگھتے ہوئے دربار میں نور بانو نے ایک ہی شخص کو متوجہ پایا تو وہ اس سے مخاطب ہو کر گانے

اور داد پانے لگی اور شاہی عتاب کا شکار ہو گئی۔ ”بند کرو یہ بکواس“ بادشاہ نے اچانک آنکھیں کھول دیں اور گرجا۔

اؤگٹھا ہوا دربار جاگ پڑا۔ ساز چپ ہو گئے نغمے کے بول مغنیہ کے حلق میں اٹک گئے اور ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

حکم ہوا مغنیہ اور مہمان کو جو اس کا عاشق معلوم ہوتا تھا فوراً گرفتار کر لیا جائے اور بادشاہ کی محویت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے باہم اشارے بازی کرنے اور آداب شاہی کی توہین کے مرتکب ہونے کے جرم میں سورج نکلنے سے پہلے دونوں کے سر قلم کر دیئے جائیں۔ اگلے روز شاہی فرمان کی تعمیل کر دی گئی۔

اس واقعے کی خبر آنا فانا سارے ملک میں پھیل گئی۔ نور بانو کے فن کے پرستاروں اور موسیقی کے قدردانوں نے جگہ جگہ جلسے کئے اور جلوس نکالے۔ لوگ نور بانو کے گائے ہوئے گیت گاتے اور سینہ کو پی کرتے اور بادشاہ کے خلاف نعرے لگاتے۔ اگرچہ ان جلوسوں اور ہنگاموں پر قابو پانے کے لئے پہلے سے خاطر خواہ انتظامات کر لئے گئے تھے پھر بھی رعایا اور شاہی فوج کے تصادم میں بہت سے لوگ مارے گئے۔ بہت سی املاک تباہ ہو گئیں۔ بعض جگہوں سے احتجاج کے طور پر لوگوں کی خود سوزی کے واقعات کی خبریں بھی ملیں۔ مگر بالآخر شورش پر قابو پا لیا گیا۔ تاہم لوگوں کے دلوں اور ذہنوں سے نور بانو کے نغموں کو نہ چھینا جاسکا۔ نور بانو کے گیت اب احتجاج کی علامت بن گئے تھے۔

مرنے کے بعد بھی نور بانو زندہ رہی اور اس کے گیتوں کی مقبولیت کم نہ ہوئی تو بادشاہ نے موسیقی پر پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ درباری دانشوروں اور مذہبی رہنماؤں کے ذریعے موسیقی کو لہو و لعب قرار دیا گیا۔ حکومت کے ایماء پر اجتماعات اور عبادت گاہوں میں موسیقی کے خلاف تقریریں کی جاتیں اور اسے فسق و فجور سے تعبیر کیا جاتا اور لوگوں کو باور کرایا جاتا کہ موسیقی سفلی جذبات کو بھڑکاتی اور حیوانی جذبات کو ابھارتی ہے۔ فرد اور معاشرے کو کامل اور بے عمل بنانے کی راہ ہموار کرتی ہے۔

کچھ عرصہ میں جونہی زمین و تر (نم) محسوس ہونے لگی اس میں ہل چلا دیا گیا اور ملک بھر میں ناچنے اور گانے پر پابندی لگا دی گئی۔ دربار سے وابستہ قوالوں، موسیقاروں، رقاصوں اور گویوں کو رخصت کر دیا گیا۔ اس کے بعد شاہی فرمان جاری ہوا جس کے ذریعے رقص اور موسیقی سے تعلق رکھنے والے تمام فنکاروں کو ایک معینہ مدت کے اندر ملک چھوڑ دینے کی ہدایت کر دی گئی۔ موسیقی کے تمام آلات، ساز اور ایسی اشیاء جو سازوں کے طور پر استعمال کی جاسکتی تھیں جمع کر کے تلف کر دی گئیں اور آئندہ موسیقی کے آلات اور ساز بنانے یا بیچنے اور استعمال کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ فرمان میں کہا گیا کہ جو شخص گاتا یا گنگناتا یا کسی بھی طرح ساز بجاتا پایا گیا اسے وہی سزا دی جائے گی جو گستاخ اور بے ادب نور بانو کو دی گئی تھی۔ پھر خفیہ پولیس کا ایک محکمہ قائم کر دیا گیا جس کے لوگ ہر شہر اور

اور کینزوں کو کھڑا کر کے بادشاہ اور امیر وزیر پہروں جھروکوں میں بیٹھ کر شطرنجی چالیں چلتے۔ لیکن جلد ہی ان چھوٹے چھوٹے مقابلوں اور کھیل تماشوں سے بادشاہ کا دل بھر گیا۔ ادھر لوگوں اور لشکریوں کے مزاج میں تشدد کھردرا پن اور تندی آگئی تھی۔ اکثر باہم لڑائی جھگڑے اور خونریزیاں ہونے لگیں۔ سارا ملک گرہوں اور طبقوں میں بٹ گیا اور ہر جگہ فتنہ و فساد برپا ہو گیا۔ ایذا پسندی، تشدد اور توڑ پھوڑ لوگوں کا شعار بن گیا۔ اب ایک ہی راستہ باقی تھا۔ جہاں بانی اور مہم جوئی۔ جس سے بادشاہ کا دل بھی لگا رہتا اور لشکر اور عوام کے تشدد پسندی کے رجحان کی بھی تسکین ہو سکتی تھی۔ سو بادشاہ نے آس پاس کے چھوٹے ممالک اور ریاستوں پر لشکر کشی شروع کر دی جس کے نتیجے میں فسادات کم ہو گئے۔ دوسری طرف مزید اسلحہ اور مال غنیمت ہاتھ آیا۔ جس سے مزید لشکر کشی کا رجحان پیدا ہوا۔ اب جب بھی اندرونی حالات زیادہ ابتر ہونے لگتے بادشاہ کسی نئی مہم پر نکل کھڑا ہوتا۔

سلطنت کی سرحدیں اب خاصی وسیع ہو گئی تھیں اور بادشاہ اپنی فتوحات سے خوش تھا۔ اگرچہ بعض اوقات رقص و موسیقی کے بغیر فتح کے جشن ادھورے ادھورے محسوس ہوتے مگر اس کی کو آتش بازی، چاند ماری اور خورد و نوش سے پورا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ لوگ اور لشکر آئے دن کی مہم جویوں سے تنگ آ گئے اور بغاوت کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

کچھ ہی عرصہ بعد ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی۔ لوگوں میں نشہ آور مشروبات اور جڑی بوٹیوں کی رغبت اور رجحان بڑھنے لگا۔ طرح طرح کے نشہ رائج ہو گئے۔ بادشاہ متفکر رہنے لگا کیونکہ لشکر میں بھی ان چیزوں کا استعمال عام ہو چلا تھا جس سے ملک کا دفاع اور حکومت کا استحکام خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ بادشاہ کو رہ رہ کر خیال آتا کہ کہیں درپردہ معاشرے میں موسیقی کسی اور روپ میں موجود نہ ہو۔ بادشاہ کو اب یقین ہو گیا تھا کہ اس کی فتوحات اور کامرانیاں جہی ممکن ہو سکی تھیں جب اس نے موسیقی کو دیس نکالا دیا تھا۔

ایک روز بادشاہ محل میں آرام کر رہا تھا کہ ستون کے کنگرے پر ایک سیاہ رنگ کا پرندہ آ بیٹھا اور نہایت خوش الحانی سے چچھانے اور لوہو کو ہوا لاپنے لگا۔ بادشاہ کو ایسا لگا جیسے وہ پرندہ نور بانو کی بدلی ہوئی صورت ہو اور اسے چڑا رہا ہو۔ بادشاہ نے کمان پر تیر چڑھایا اور پرندے کو ہلاک کر ڈالا۔

اگلے روز ایک اور شاہی فرمان جاری ہوا کہ سلطنت کی حدود میں چچھانا ممنوع قرار دے دیا گیا ہے اور ایسا ہر پرندہ مارنے پر انعام دیا جائے گا جس کی آواز چچھاہٹ پر موسیقی یا غنائیت کا شبہ ہو سکتا ہے۔ ملک بھر میں چڑی مار اور شوقیہ شکار کرنے والے خوش الحان پرندوں کے شکار کو اٹھ کھڑے ہوئے اور چند ہی روز میں ملک سے بلبلوں، قمریوں، کولموں، پیپیوں، فاختاؤں، چڑیوں اور موروں کو ختم کر دیا گیا۔

سلطنت میں اب کہیں سے گانے، گنگنانے، چہچہانے اور ساز بجانے کی آواز سنائی نہ دیتی تھی مگر فحشیات کے استعمال میں کمی نہ ہوئی۔ لڑائی جھگڑوں اور خونریزیوں کے واقعات میں اضافہ ہو گیا۔ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کو لہو لہان کر دیتے ایک دوسرے کی ٹکا بوٹی کر دیتے۔ دشمن کو طرح طرح کی تکلیفیں دے کر ہلاک کیا جاتا۔ خون بہانے کے لئے کوئی دشمن نہ ملتا تو اپنے پیٹ یا چھاتی میں خنجر گھونپ لیتے۔

پھر سلطنت کے بعض حصوں سے اس قسم کی خبریں آنے لگیں کہ فلاں قصبے یا شہر میں فلاں آدمی کے سر پر سینگ اگ آئے ہیں۔ بعض عورتوں کے چہروں پر مونچھیں اور داڑھیاں نکلنے کی اطلاعات بھی ملنے لگیں۔ مگر اس سے حکومت پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ بادشاہ نے ان خبروں کو کوئی اہمیت نہ دی۔

آہستہ آہستہ سینگوں والے مردوں اور مونچھوں والی عورتوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ لوگ رات کو اچھے بھلے سوتے مگر صبح اٹھ کر آئینہ دیکھتے یا سر اور چہرے پر ہاتھ پھیرتے تو ان کے سینگ اگ آئے ہوتے یا مونچھیں نکل آئی تھیں۔ کچھ ہی عرصہ میں ملک بد مزاج اور بد شکل لوگوں سے بھر گیا۔ مگر بادشاہ قطعاً پریشان نہیں تھا۔ رعایا خوبصورت ہو یا بد صورت اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ سوچتا غلامی اور بد صورتی کا ویسے بھی پرانا ساتھ ہے۔

لیکن اب بے کانوں کے بچوں کی پیدائش نے بادشاہ کو حیران کر دیا تھا۔ اگر ملکہ نے بھی کانوں کے بغیر بچے کو جنم دیا تو؟ ----- یہ سوچ کر بادشاہ کو جھرجھری آ جاتی۔

بادشاہ رات بھر ٹھلٹا اور سوچتا رہا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر نور بانو کے واقعے اور موسیقی سے کانوں کے بغیر بچوں کی پیدائش کا تعلق نہ بھی ہو تو بھی مصلحت اور احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ملکہ کے لئے موسیقی کا انتظام کر دیا جائے مگر اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعر و نغمہ یا موسیقی کا انتظام کیسے کیا جائے۔ ملک بھر میں مغنیوں اور موسیقاروں کی تلاش ہوئی۔ پڑوسی ممالک کی طرف ہر کارے دوڑائے گئے۔ ساز تیار کرنے کے احکامات بھی دیئے گئے مگر اس سے پہلے کہ کوئی ساز تیار ہوتا یا کوئی مغنی محل میں داخل ہوتا ملکہ نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ لیکن یہ دیکھ کر بادشاہ کے ہوش اڑ گئے کہ ولی عہد کانوں سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی محروم تھا۔



جھیل اور مچھلی

وہ روٹھ کر چلا گیا ہے۔

کئی مہینے گزر گئے ہیں مگر اس کا کچھ پتہ نہیں۔

مجھے اس کی واپسی کی کوئی توقع نہیں مگر سلطانہ ناامید نہیں ہوئی۔ اسے تو شاید پوری طرح علم بھی نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا ہے۔ وہ منہ سے تو کچھ نہیں کہتی مگر اس کے رویے اور باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اسے اس کی واپسی کا یقین ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی وہ اس طرح بغیر کچھ کہے سنے چپ چاپ کہیں نکل جاتا تھا پھر کچھ ہفتوں بعد خود ہی کسی شام لوٹ آتا تھا۔ میرا جی چاہتا ہے سلطانہ کو سچ سچ بتا دوں کہ اس بار وہ ہمیشہ کے لئے چلا گیا ہے اور اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ وہ پڑھی لکھی معاملہ فہم اور روشن خیال ہے۔ ضرور بدلے ہوئے ماحول سے مطابقت پیدا کر لے گی مگر پھر ڈرتا ہوں اگر اس نے حالات سے سمجھوتہ نہ کیا تو؟

جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے مجھے اس کے جانے کا اب کچھ زیادہ رنج نہیں ہے کہ اسے آخر ایک روز جانا ہی تھا۔ البتہ شروع شروع میں کچھ روز تک مجھے اس کی کمی ضرور محسوس ہوئی تھی۔ گھر کا پالتو کتا بھی کہیں چلا جائے تو آدمی کئی روز تک اس کی کمی محسوس کرتا رہتا ہے۔ اس کا میرا تو پھر برسوں کا ساتھ تھا۔

میں سلطانہ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا کہ اب میں خود کو زیادہ آزاد اور پرسکون محسوس کرتا ہوں بے شک اس کی وجہ سے گھر اور زندگی میں بہت رونق اور دلکشی تھی مگر وہ برابر اس کی قیمت وصول کرتا رہتا تھا۔ اس کی وجہ سے میرے ذہن پر ایک بوجھ سارہتا اور میں بہت سے ذہنی کام عمدگی سے انجام نہ دے سکتا۔ وہ مجھ پر حکم چلاتا رہتا اور مجھ سے ایسے کام کراتا جو مجھے زیب نہ دیتے تھے اور جن میں قدم قدم پر عزت و وقار کو داؤ پر لگانے کا خطرہ موجود ہوتا تھا۔ رات کو اکثر مجھے شریف گھرانوں، رشتہ داروں اور دوستوں کے ہاں چوری کی غرض سے لے جاتا۔ میں اس کے حکم سے سرتابی نہ کرتا اور بعض ایسے قریبی عزیزوں کے گھروں میں بھی نقب لگانے پر مجبور ہوتا جو مجھ پر نہایت اعتماد کرتے تھے۔ وہ تو غنیمت ہے میرے پاس سے کچھ برآمد نہ ہو اور نہ زندگی گزارنا دو بھر ہو جاتی۔ یہ درست ہے کہ اپنے اوپر حکم چلانے اور رعب جمانے کا اختیار میں نے خود اسے تفویض کیا تھا لیکن ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے اب کہ میرے

دماغ کو بے حد سنجیدہ اور اہم سوالات گھیرے رکھتے تھے میں اس سے نجات حاصل کرنا اور اختیارات واپس لینا چاہتا تھا مگر وہ اس قدر خود سر ہو گیا تھا کہ میری کسی بات کو خاطر میں نہ لاتا۔ اور جیسا چاہتا فیصلہ کر دیتا۔ گھر سے روٹھ کر جانے کا فیصلہ بھی اس نے اس خود کیا حالانکہ اگر وہ مجھ سے مشورہ کرتا تو میں اپنے لئے نہ سہی سلطانہ کی خاطر اسے کبھی جانے نہ دیتا۔ سلطانہ کے بارے میں وہ غلط فہمی کا شکار تھا۔

سلطانہ اسے پسند ضرور کرتی تھی مگر وہ سمجھتا تھا وہ میرے بجائے اس سے محبت کرتی اور اسی کی وجہ سے اس گھر میں رہتی تھی۔ اس کے جانے سے اس بات کا بھی فیصلہ ہو جائے گا کہ اس کا دعویٰ کہاں تک درست تھا۔ مجھے یقین ہے کہ سلطانہ ایسی نہیں لیکن پھر بھی ایک خوف سا میرے ذہن میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا ہے کہ اگر اس کی بات سچ نکلی تو؟

دراصل سلطانہ اس کے بارے میں سب باتیں نہیں جانتی۔ وہ اسے بھی میرے ہی وجود کا ایک ضروری حصہ سمجھتی رہی ہے۔ اسے کیا پتہ کہ وہ مجھ سے کیا کیا نا انصافیاں کرتا رہتا تھا۔ یہ درست ہے کہ خدا نے ہماری صورتیں ایک جیسی بنائی تھیں اور ہمیں ایک ساتھ پیدا کیا تھا مگر اس نے ہماری قسمت ایک جیسی نہیں بنائی تھی۔ اس نے میرے نصیب میں رہٹ کھینچنا اور اس کی قسمت میں گاہدی پر بیٹھنا لکھ دیا تھا۔ میں رہٹ کھینچ کھینچ کر پسینے میں شرابور ہوتا رہتا اور وہ گاہدی پر بیٹھا مایہ پے پے کا گانا اور ڈچکریں مارتا رہتا۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے میرے حصے کا کھانا کھاتا، دسترخوان سے ساری اچھی چیزیں سمیٹ لیتا اور فریبہ ہوتا رہتا۔ کھانا ہی نہیں وہ اکثر میرے حصے کی لذت بھی اپنے حلق اور شکم میں بھر لیتا۔ میں نے کئی بار احتجاج کیا مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔ سخت دھوپ میں پیدل سفر کرنا پڑتا۔ تو وہ میرے کندھوں پر سوار ہو جاتا۔ رات کو جب میں تھکا ہوا اور نڈھال ہوتا اور سو جانا چاہتا وہ مجھے آدھی آدھی رات تک من گھڑت لذیذ کہانیاں سنانے کے لئے جگائے رکھتا۔ کروٹیں بدل بدل کر میری پسلیاں دکنے لگتیں مگر اس کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتیں اس کی سوچ شروع ہی سے مجرمانہ تھی۔ وہ مجھے ہر رات کسی نہ کسی جرم اور واردات پر اکساتا رہتا وہ علیحدہ بات ہے کہ دن کی روشنی پھیلتے ہی میں اس کے سارے منصوبے ذہن سے جھٹک دیتا۔ انتہا یہ ہے کہ میں سو جاتا تو بھی وہ مجھے خوابوں میں طرح طرح کے روپ بدل کر ستا رہتا۔

کبھی ڈراتا، کبھی رلاتا اور کبھی گد گداتا۔ جن دنوں میں ہائی سکول کے آخری درجے میں پڑھتا اس نے مجھے امتحان میں فیل کرانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ دن بھر بیکار گھماتا اور سیریں کرتا۔ کتاب میں جی نہ لگنے دیتا۔ رات کو سونے نہ دیتا۔ اور آنکھ لگ جاتی تو بھی شرارتوں اور شیطانوں سے باز نہ آتا۔ یہ چھوٹی چھوٹی شرارتیں اور چھینر خانیاں تو خیر پھر بھی قابل برداشت تھیں لیکن کالج

پہنچ کر اس نے مجھے بڑی بڑی الجھنوں میں پھنسانا شروع کر دیا۔ دن بھر بازاروں، گلیوں اور جھروکوں کی سیر پر لئے لئے پھرتا۔ رات کو جب میرے پڑھنے کا وقت ہوتا وہ فحش کتابیں اور گندی تصویریں کھول کر بیٹھ جاتا۔ ایک روز جب میں اگلی صبح ہونے والے لٹس کی تیاری کر رہا تھا کہنے لگا۔

”تم نے فیروزہ کی جھیلوں جیسی آنکھیں دیکھی ہیں؟“

”ہاں“

”تم نے ان جھیلوں میں کبھی کسی جذبے کی مچھلیاں تیرتے دیکھی ہیں؟“

”میں نے غور نہیں کیا۔“

”بے وقوف“ وہ ہنسنے لگا اور دیر تک میری سادگی اور بیوقوفی کا مذاق اڑاتا رہا۔

اگلے روز جب وہ مجھے لائبریری میں مل گئی تو میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور یہ جان کر مسرور ہوا کہ سچ مچ اس کی آنکھوں میں ایک انوکھے جذبے کی رنگ برنگ مچھلیاں تیرتی پھرتی تھیں۔ اس کے بعد ہم کالج کے بعد بھی ملنے لگے۔ وہ بہت اچھی باتیں کرتی تھی۔ میں گم صم بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ مجھے فیروزہ کی باتوں کی جواب میں کوئی ایک آدھ خوبصورت سا جملہ بتا دیتا تو فیروزہ کی آنکھوں میں خوشی اور محبت کے جذبوں کی مچھلیاں تیزی سے حرکت کرنے لگتیں۔ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے۔ مجھے فیروزہ کے چنگل میں پھنسا کر وہ خود مزے کی نیند سوتا رہتا۔ لیکن پھر جب میرے اور فیروزہ کے درمیان ایک ایسی غلط فہمی پیدا ہو گئی جسے وہ دور کر سکتی تھی نہ میں نظر انداز۔ اور ہمارے درمیان ترک تعلق ہو گیا تو میں نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ اپنے فیصلے خود کیا کروں گا۔ اور اس کا کوئی مشورہ کبھی قبول نہیں کروں گا۔ مگر اس نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ مجھے اس کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ لیکن یہ ایک لمبی کہانی ہے۔

ہوایوں کہ فیروزہ نے مایوس ہو کر یا ضد میں آ کر شادی کر لی اور کسی اور کے بچے جننے لگی۔ وہ مجھے منع کرتا رہا مگر میں نے سر میں خاک ڈالی اور تنہائی کے بیاباں کی راہ لی۔ یہ بیاباں پچیس برس لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ میں بے آب و گیاہ صحرا میں بھٹکتا پھرا۔ بوند بوند پانی کو ترستا۔ میرا بدن جھلس گیا۔ پاؤں میں آبلے پڑ گئے۔ آخر میں نے گھبرا کر باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈنا شروع کیا مگر باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ آخر کار مجھے مجبوراً اس کی مدد لینا پڑی۔ اس کے لئے اس قسم کا کام کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر لے آیا اور مجھے ایک دوسری فیروزہ کے حوالے کر دیا۔ یہ سلطانہ تھی۔ وہی قد بت، وہی شکل و صورت، وہی سن و سال اور وہی جھیل

آنکھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ فیروزہ کی آنکھوں میں جذبوں کی مچھلیاں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تیرتی رہتی تھیں۔ مگر سلطانہ کی آنکھوں میں جذبوں کی مچھلیاں تیرنا نہ جانتی تھیں۔ میں انہیں کافی عرصہ تک تیرنا سکھاتا اور ڈوبنے سے بچاتا رہا۔ مگر ذرا سی غفلت ہو جاتی تو ایک آدھ مچھلی مرکز سطح آب پر تیرنے لگتی جسے کوئی بے قابو لہر آپ ہی آپ کنارے پر لا پھینکتی۔ پھر آہستہ آہستہ مرنے والی مچھلیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اور یہ صورت حال دیکھ کر وہ چپکے سے کھسک گیا اور اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔

اس کے جانے کے بعد پورے ہوش و حواس سے اس کی کارستانیوں کا تجزیہ کرتا ہوں تو یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اس نے مجھے مفلس کر دیا تھا۔ میں کفایت شعاری سے کام لینا چاہتا۔ بچی کھچی جمع پونجی سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا مگر وہ بہت فضول خرچ تھا۔ ایک ایک رات میں لاکھوں کروڑوں ہار کر مجھے کوڑی کوڑی کا محتاج کر گیا۔ یہی نہیں اس کا جب جی چاہتا تھا میرے بدن سے خون نچوڑ لیتا تھا۔ جہاں سے چاہتا گوشت کے ٹکڑے کاٹ لیتا۔ رات رات بھر سولی پر لٹکائے رکھتا۔ خاردار راستوں پر ننگے پاؤں چلنے پر مجبور کرتا۔ گھسن گھیر میں پھینک دیتا۔ چاروں طرف آگ جلا کر اور مجھے اس میں جلتا چھوڑ کر کہیں غائب ہو جاتا۔ رات کو بستر میں زہریلے سانپ اور بچھو چھوڑ دیتا۔ میں احتجاج کرتا تو ہنسنے لگتا۔ کافی دنوں سے میرے اور اس کے درمیان رسہ کشی ہو رہی تھی۔ میں اس سے بغاوت پر آمادہ تھا مگر وہ اپنے لچھے دار باتوں میں الجھا کر مجھے اپنی گرفت سے نکلنے نہ دیتا لیکن ایک بار میں اتفاقاً اس چٹان پر جا چڑھا جہاں جانے سے وہ مجھے منع کیا کرتا تھا۔ چٹان پر کھڑے ہو کر جب میں نے دوسری طرف کا منظر دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور کئی روز تک میری زبان گنگ رہی۔ اور میں سوچنے سے بھی ڈرتا رہا۔ اگرچہ اب اس منظر کی دہشت میرے دل و دماغ سے بہت حد تک کم ہو چکی ہے لیکن ایک عجیب سی ناامیدی اور مایوسی کی دھند نے میری روح کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اور میں ان سنہرے دنوں کو یاد کرتا ہوں جب میں نے یہ منظر نہیں دیکھا تھا میں اس منظر کو بھول جانا چاہتا تھا لیکن جس طرح کمان سے نکلے ہوئے تیر کو آواز دے کر واپس نہیں بلایا جاسکتا یا زبان سے ادا ہو جانے والے الفاظ کو دوبارہ چبا کر نگلا اور خیال میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا اسی طرح ایک بار دیکھ لیا جانے والا منظر بھی حافظے کی سلیٹ سے کھرچا نہیں جاسکتا۔ میرا سکون اور چین غارت ہو گیا مگر وہ مجھے پریشان حال دیکھ کر ہنستا اور کہتا۔

”سچ کا چہرہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے میں منع کرتا تھا اب بھگتو۔“

”میں بھگتنے کے لئے تیار ہوں لیکن میں مچھلیوں کو ڈوبنے سے نہیں بچا سکتا۔“

میں سمجھتا ہوں اس کا چلے جانا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔ میں اس کی غلامی اور دھونس سے آزاد ہو گیا ہوں۔ جرائم اور بے

اعتدالیوں سے اس کی رغبت مجھے مزید الجھنوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر سکتی تھی۔ اب میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہوں۔ اب اپنے احسانات جتا جتا کر شرمندہ کرنے اور مجھ پر حکم چلانے والا کوئی نہیں ہے۔ اب گھر میں میں ہوں اور سلطانہ۔ سلطانہ بہت اچھی ہے۔ پڑھی لکھی اور معاملہ فہم۔ میرا اندازہ ہے اسے اگر پتہ چل بھی گیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے چلا گیا ہے تو بھی وہ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کرے گی۔ اس کی جھیل آنکھوں میں آہستہ آہستہ ٹھہراؤ اور سکوت پیدا ہو جائے گا اور میل کچیل تہہ میں بیٹھ جائے گا۔ گہرے پانی کو گدلا کرنے والا کوئی نہ ہو تو وہ خود بخود صاف اور شفاف ہو جاتا ہے اور اس کی نیلا ہٹ میں تہہ کی ہر چیز نظر آنے لگتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی ماں فیروزہ کی طرح جلد باز اور جذباتی نہیں۔ وہ مایوسی کا شکار ہو کر یا ضد میں آ کر ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرے گی کہ مجھے ایک بار پھر بیا بان کی راہ لینا پڑے جہاں سے اب مجھے واپس لانے والا بھی کوئی نہیں کہ وہ تو روٹھ کر ہمیشہ کے لئے چلا گیا ہے۔



گرم اور خوشبودار چیزیں

دروازے پر دستک کی آواز سن کر اس نے پڑھتے پڑھتے سراو پر اٹھایا اس کا خیال تھا بیوی کی کوئی ملنے والی یا بچوں کا کوئی دوست ہوگا۔ جواب نہ ملنے پر خود ہی پلٹ جائے گا مگر تھوڑی دیر بعد پھر دستک دی وہ اوپر کی منزل میں تھا اس لئے آواز دے کر نہیں جان سکتا تھا کہ دروازے پر کون ہے نا چار اسے بستر استراحت سے اٹھنا پڑا۔

اس نے کتاب میں نشانی رکھی اور اسے ایک طرف ڈال کر سلیپر پہنے کرتے کے بٹن بند کئے اور کمرے سے باہر جانے لگا۔ غسل خانے کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے خیال آیا کیوں نہ آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مار لے۔ اس کی آنکھیں مسلسل پڑھتے رہنے کی وجہ سے بھاری بھاری تھیں جیسے کچی نیند سے جاگنے کے بعد ہوتی ہیں۔ پھر اس نے آئینے میں دیکھا تو اسے اپنے الجھے اور بکھرے ہوئے دکھائی دیئے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے اس نے سوچا اور کنگھی کئے بغیر سیڑھیاں اترنے لگا۔

دستک دینے والا شاید جلدی میں تھا اس کے دروازے تک پہنچنے اور کنڈی کھولنے تک کئی بار دستک دے چکا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو ساتھ کے سروٹ کو اڑکا لڑکا کھڑا تھا۔

”میری گیند چھت پر چلی گئی ہے اتار لوں۔“

”اتار لو“ اس نے جواب دیا اور واپس آ کر دوبارہ کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ مگر ابھی اس نے ایک آدھ صفحہ ہی پڑھا تھا کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اس نے سوچا شاید دستک دینے والا جواب نہ ملنے پر خود ہی واپس چلا جائے مگر دستک کی آواز برابر سنائی دیتی رہی تو اس نے کتاب میں نشانی رکھی اسے اٹھا کر ایک طرف ڈال کر سلیپر پہنے لگتا ہوا ازار بند سنبالا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ دروازے پر بھیک مانگنے والا ایک بوڑھا کھڑا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر وہ خالی تھی مگر وہ خالی تھی پہلے تو اس کا جی چاہا اوپر جا کر کچھ پیسے لادے مگر پھر اس نے معذرت کر لی۔ اور دروازہ بند کر کے اوپر چلا آیا۔ اسے یہ سوچ کر طمانیت محسوس ہوئی کہ اسے دونوں مرتبہ نیچے اتر کر دروازہ کھولنے سے جھلاہٹ ہوئی ہے نہ غصہ ہی آیا ہے۔ ہسپتال جانے سے پہلے وہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑک اٹھتا تھا۔ مگر اب اس نے بڑی بڑی باتوں پر بھی درگزر کرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ نہایت ہی چونکا دینے والی بات بھی تحمل سے سن سکتا اور بری سے بری خبر پر بھی پرسکون رہ سکتا تھا۔ یوں تو ڈاکٹروں نے بھی اسے اعصابی تناؤ اور دباؤ سے پرہیز بتایا تھا مگر ایک لمبے عرصے

تک ہسپتال میں رہنے اور بارہا موت کی چاپ قریب سے سننے کے بعد اس کی اپنی نفسیات بھی بدل گئی تھی۔ وہ اتنی بارہا مر اور جیا تھا۔ کہ اب اسے بعض اوقات پتہ نہ چلتا وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ اگرچہ وہ جسمانی طور پر تندرست اور بھلا چنگا تھا مگر اس کے اندر جیسے کوئی چیز مر گئی تھی۔ اسے لگتا موت ایک ظالم جادوگر ہے جس کو جل دے کروہ بھاگ آیا ہے پتہ نہیں کب وہ اپنے کالے علم سے اس کے ٹھکانے کا پتہ چلا لے اور پلک جھپکنے میں اس تک پہنچ جائے۔

شروع شروع میں جب اس نے موت کا خطرہ ٹلنے کی خبر سنی تھی تو اسے بہت اطمینان اور خوشی حاصل ہوئی تھی۔ گھر واپس آ کر بھی چند روز تک وہ خوشی اور طمانیت محسوس کرتا رہا تھا۔ جب وہ ایک عرصے کے بعد اپنے بیڈروم میں اپنے بستر پر لیٹا تو اسے عجیب سی راحت ملی۔ اس نے پرہیز کی خاطر چھوڑی ہوئی غذا کیں دوبارہ چکھنا شروع کیں تو اسے ان کے ذائقے بہت ہی نئے اور اچھے معلوم ہوئے۔ وہ کوئی کام کرتا۔ کوئی لذیذ چیز کھاتا یا کوئی خوبصورت منظر دیکھتا تو اسے یہ جان کر عجیب سی خوشی ہوتی کہ وہ زندہ ہے اور اس چیز کھانے یا منظر سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ مگر پھر آہستہ آہستہ اس کا یہ احساس اداسی میں تبدیل ہونے لگا اسے خیال آتا کہ اگر وہ زندہ نہ بچتا تو اس خوشی لذت یا لطف سے محروم رہتا جو اس وقت اسے حاصل ہو رہی ہے۔ پھر اسے ہر کام اور بات سے خود کو منہا کر کے دیکھنے کی لت سی پڑ گئی۔ جب بھی کوئی چھوٹی یا بڑی راحت یا خوشی اس سے ہمکنار ہونے لگتی وہ ایک آدھ بار خود کو منہا کر کے ضرور دیکھتا اور یہ جان کر اداس ہو جاتا کہ خوبصورتیوں لذتوں منظر اور خوشیوں کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس کے بغیر بھی موجود تھیں اور موجود رہ سکتی تھیں۔ شاید ہی کوئی ایسا کام تھا جو اس کے نہ ہونے کی وجہ سے رک سکتا ہو بعض کاموں میں واقعی اس کی ضرورت تھی مگر کہیں بھی اس کی موجودگی ناگزیر نہیں تھی۔ حد یہ تھی کہ اس سے بہت محبت کرنے والے بھی اس کے بغیر نہ صرف زندہ تھے بلکہ اسی طرح کھاتے پیتے اور ہنستے بولتے تھے۔ وہ بازار جاتا تو دیکھتا کہ لوگوں کے اتنے جھوم میں صرف ایک آدمی کی کمی کا کسی کو مطلق احساس نہ تھا۔ وہ دفتر میں کسی چٹھی یا نوٹ پر دستخط کرنے لگتا تو اسے خیال آتا کہ اس کے زندہ نہ بچنے کی صورت میں اس وقت اس کا فلاں کو لیگ اس کی کرسی میں بیٹھا ہوتا اور دستخط کر رہا ہوتا۔ ایک بار گاڑی چلاتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اگر وہ جانبر نہ ہوتا تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ فرق پڑتا کہ اس وقت آگے والے ٹرک کو راستہ دینے کے لئے تھوڑا سا سڑک کے بائیں جانب نہ ہونا پڑتا اور پیچھے آنے والی فلائنگ کوچ کو ہارن نہ بجانا پڑتا۔ ایسی باتیں سوچ سوچ کر اس کے اندر اپنے وجود کی بے معنویت زندگی کی کم مائیگی اور دنیا کی بے شہائی کا احساس شدید تر ہو جاتا۔ اور اسے زندہ ہونا یا نہ ہونا ایک جیسا معلوم ہونے لگتا۔ وہ سوچتا اگر فنا ہی ہر چیز کا مقدر ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ چیز یا شخص ہو یا نہ ہو۔ آخر کتنے کروڑوں اربوں لوگ ایسے ہوں گے جو پیدا ہو سکتے تھے مگر پیدا نہ ہوئے

ان کی پیدائش روک دی گئی۔ یا وہ پیدا ہوتے ہی یا کچھ عرصہ بعد اس دنیا کو دیکھے اور اس کا ذائقہ چکھے بغیر دوبارہ عدم کا حصہ بن گئے۔ اور کتنے ہی اربوں کھربوں لوگ ہوں گے جن کی پیدائش کے اسباب ہی سرے سے مہیا نہ ہونے دیئے گئے۔ مگر کیا کبھی کسی کو ان کی کمی محسوس ہوئی ہے اور کیا کبھی کوئی ان پیدا نہ ہونے والوں کو یاد کر کے روتا ہے؟ وہ سوچتا اگر موت اٹل ہے تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آدمی نے مرنے سے پہلے کتنے شہروں یا ملکوں کی سیر کی۔ کتنی اور کیسی کتابیں پڑھیں، کیسے لذیذ کھانے کھائے یا ان سے محروم رہا۔ اور تاش یا شطرنج کی کتنی بازیاں جیتیں یا ہاریں۔

رفتہ رفتہ اس کا یہ احساس اتنا شدید اور پختہ ہو گیا کہ وہ سوچتا اگر آدمی کو بہر حال مرنے سے تو اس سے بھی فرق پڑتا ہے کہ اس کا نام کسی وجہ سے دنیا میں روشن رہے اور موت کے بعد بھی چند سال یا صدیاں یاد رکھا جائے۔

اس کی بیوی کو اس کی ایسی باتوں سے ہول آتا تھا اور وہ اسے کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتی رہتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ موت کا خوف اس کی روح سے چمٹ گیا ہے اور اگر وہ اس خوف سے آزاد نہیں ہوگا تو زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اسے خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ وہ بدل گیا ہے ایک اداسی اور پڑمردگی اس کے دل میں گھر کر گئی ہے اس کی طبیعت کی ساری شگفتگی، تندہی اور تیزی سرد پڑ گئی ہے اور اس کی سنجیدگی اور دھیمے پن نے لے لی ہے۔ بیمار پڑنے سے پہلے وہ ہر کام میں جلدی کرتا تیز چلتا، تیز بولتا، جلدی جلدی کھانا کھاتا، تیز گاڑی چلاتا، گھنٹوں کا کام منٹوں میں کر دینا چاہتا۔ انتظار اور تجسس سے اسے الجھن ہونے لگتی معمولی سی خوشی پر کھل اٹھتا۔ چھوٹی سی بات یا سننے سنائے لطیفے پر دل کھول کر ہنستا اور ذرا سی بات پر آگ بگولا ہو جاتا۔ مگر بیماری کے دوران میں جیسے کسی نے اس کے اندر سے ساری گرم اور خوشبودار چیزیں نکال کر ان کی جگہ روٹی اور برف بھر دی تھی اب اسے کائنات میں موت سے زیادہ کوئی چیز یقینی اٹل اور سچی معلوم نہ ہوتی تھی۔

جب ہسپتال سے فارغ ہو کر لوٹا تھا سب کا یہی خیال تھا کہ بیماری کے اثرات کم ہونے کے بعد وہ نارمل ہو جائے گا اور پہلے کی طرح ہنسنے بولنے لگے گا مگر اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس کے دل میں کوئی امنگ جاگی تھی نہ ترنگ۔ دماغ میں گزرے ہوئے تلخ واقعات اور دنوں کی تصویریں گھومتی رہتیں۔ اٹنے سیدھے خواب دکھائی دیتے۔ دیکھتا کہ اس کا آپریشن ہو رہا ہے۔ ڈاکٹروں نے اس کو چیر پھاڑ کر رکھا ہوا ہے اور اب ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کریں۔ صبح اس کی بیوی اسے جگانے آتی تو بعض اوقات وہ اسے زس سمجھ کر ڈرپ لگوانے کے لئے بازو آگے کر دیتا۔ ہسپتال سے آئے اسے کئی ہفتے ہو گئے تھے مگر ایک ہسپتال اس کے اندر کھل گیا تھا جہاں ہر وقت نرسیں اور ڈاکٹر بھاگے دوڑے پھرتے۔ سپرٹ اور دوائیوں کی بو ہر طرف پھیلی ہوتی۔ مریض کراہتے

تھیں کرتے اور دم توڑتے رہتے۔ وہ بار بار سوچتا کہ جب فریشنوں نے جواب دے دیا تھا اور سرجن ناامیدی کا اظہار کر چکے تھے تو پھر وہ تندرست کیسے ہو گیا۔ کیا یہ کوئی معجزہ تھا یا محض حسن اتفاق۔ وہ سوچتا چھوٹی چھوٹی باتیں مل کر کیسے ایک بڑا واقعہ یا حادثہ بن جاتی ہیں اگر وہ اپنے فیملی ڈاکٹر کی تشخیص اور علاج پر قانع رہتا تو اصل مرض انجانے میں اسے پتہ نہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیتا اگر اس روز ایک ایمرجنسی کی وجہ سے اس کا آپریشن ملتوی نہ ہو جاتا تو سرجن یقیناً اسے چیر بھاڑ کر رکھ دیتے کیونکہ انہوں نے آپریشن کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کبھی وہ سوچتا اگر لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ پازیٹو آ جاتی تو؟۔۔۔۔۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوتی تھی کہ ساری پازیٹورپورٹیں مریض کے حق میں نیکی ہو جاتی تھیں پازیٹو یہ شاید ڈاکٹروں کے حق میں ہوتی ہیں کبھی اسے خیال آتا کہ اگر سے اس رات بروقت طبی امداد نہ ملتی یا انجکشن دستیاب نہ ہوتا تو انجام کیا ہوتا؟ ہسپتال کا ایک منظر اسے رہ رہ کر یاد آتا تھا۔ ایک شام اس کی حالت اچانک بگڑ گئی تھی اس کے عزیز واقارب نے ڈاکٹروں اور نرسوں کو بلانے کے لئے بھاگنا دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ بعض رونے دھونے لگے پھر اسے آکسیجن لگائی گئی اور بڑے ماموں نے اس کے ہیڈ کے قریب بیٹھ کر سورہ یسین کی تلاوت شروع کر دی تھی۔

وہ اکثر سوچتا اگر وہ اس روز مر جاتا تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی اس نے تو ابھی کوئی وصیت بھی نہیں لکھی تھی بعض اہم کاغذات کے بارے میں بیوی کو کچھ نہیں بتایا تھا نہ قرضے کا ذکر ہی کیا تھا۔ آکسیجن لگے ہوئے بھی رہ رہ کر اسے وصیت نہ کر سکنے کا افسوس ہو رہا تھا اگر وہ اس روز مر جاتا تو چھوٹی بہن کو بہت تکلیف ہوتی کیونکہ وہ اسی صبح اسے قدرے بہتر حالت میں دیکھ کر واپس اپنے سسرال گئی تھی۔ پھر چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے کفن وغیرہ خریدنے اور بارش کی وجہ سے قبر کھودنے میں دقت پیش آتی۔

وہ تصور کی آنکھ سے کئی بار اپنے مرنے اور مرنے کے بعد کے مختلف مناظر دیکھ چکا تھا اور اسے ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے سچ مچ اس نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ کیسے اس کی میت گھرائی گئی کیسے کہرام مچا۔ کیسے اسے غسل دیا گیا۔ جنازے میں کون کون لوگ شریک ہوئے اور اسے کہاں اور کیسے دفنایا گیا۔ اور قبر پر مٹی کیسے ڈالی گئی۔ قبرستان سے بھاگنے کی سب سے زیادہ جلدی کسے تھی اور کون سب کے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک اس کی قبر کی پابندی پر کھڑا پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا تھا۔

اس نے ہسپتال سے گھر آنے سے چند روز پہلے ڈائری لکھنا شروع کر دی تھی جس میں اس نے اپنی بیماری اور علاج کا مرحلہ وار ذکر کیا تھا اور ہسپتال کی حالت ڈاکٹروں نرسوں اور عملے کے دوسرے لوگوں کے رویے اور سلوک کے بارے میں اپنی رائے اور تاثرات قلمبند کئے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے تجربے اور مشاہدے سے اخذ کئے ہوئے صحت کے اصولوں کا بھی ذکر کیا تھا جو اسے ڈاکٹروں اور اخبارات میں چھپنے والے مضامین کے ذریعے پہلے بھی معلوم تھے مگر ان کی صداقت اور معنویت پوری طرح اب

اس پر واضح ہوئی تھی۔ اس نے ان اصولوں پر سختی سے کاربند رہنے کا تہیہ کر لیا تھا اور ان پر پوری طرح عمل کر رہا تھا۔ ان رہنما اصولوں کی روشنی میں اس نے بہت سی غیر ضروری مصروفیات ترک کر دی تھیں وہ صحت اور تندرستی کو ہر چیز پر فوقیت دیتا تھا اور اس کی خاطر بہت سے مشاغل، خوشیوں اور لذتوں سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اس کا دل کہیں آنے جانے اور ملنے ملانے کو نہیں چاہتا تھا۔ اس کی بیوی کسی ساگرہ یا خوشی غمی کی تقریب میں شرکت کے لئے اصرار یا ہتکرات کرتی تو وہ اسے ٹال دیتا۔ اس کی بیوی کا کہنا تھا کہ اسے زندگی کے معاملات اور مسائل میں پہلے کی طرح گہری دلچسپی یعنی چاہیے اور نارمل زندگی گزارنی چاہیے شاید وہ پوری طرح اندازہ نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اندر سے کتنا بھجھ گیا ہے۔ آج صبح بھی وہ تقریباً ناراض ہو کر گئی تھی۔ اس نے جانے سے پہلے پھر اپنی بات دہرائی تھی کہ اسے اپنی پھوپھی زاد یتیم بہن کو خود جا کر رخصت کرنا چاہیے۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتی تھی کہ اس کا جانا ضروری ہے۔ پھوپھی جان نے بھی بہت تاکید کی تھی مگر اس کا دل ہی نہ چاہتا تھا۔ شادی بیاہ کے موقع پر ویسے بھی خاصا اودھم مچتا اور بہت بے آرامی رہتی ہے۔ بعض اوقات کھانے پینے میں بھی بد پرہیزی ہو جاتی ہے۔ پھر طرح طرح کے لوگ ملتے ہیں اور کئی قسم کے جراثیم اور بیماریاں لگنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس کی بیوی بہت ہوشیار قسم کی عورت تھی۔ خصوصاً ایسے معاملات میں اس نے شادی کی خوب تیاری کر رکھی تھی اس لئے اسے فکر نہیں تھی۔ فکر مند ہونا اس نے یوں چھوڑ دیا تھا جب اس کی بیوی کا اصرار بہت بڑھا تو اس نے اس دلیل سے کام لیا جو پچھلے کئی ماہ سے ایسے موقعوں پر اس کے کام آ رہی تھی۔ کہ اگر وہ جانبر نہ ہوتا تو بھی تو کوئی کام نہ رکتا۔۔۔۔۔ اس کے بغیر بھی تو رخصتی اسی طرح ہو جاتی

اس کی یہ دلیل اس قدر مضبوط تھی کہ کوئی اس کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا۔ جب تیسری بار پھر دستک ہوئی تو اس نے اسی طرح نشانی رکھ کر کتاب بند کی۔ سلیپر پہنے اور خراماں خراماں نیچے اتر۔۔۔۔۔ دستک دینے والے کو شاید بہت جلدی تھی وہ سمجھ رہا ہوگا کہ وہ گھوڑے بیچ کر سو رہا ہے وہ برابر دستکیں دیئے جا رہا تھا مگر اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ نہایت اطمینان اور دھیسے پن سے چلتا ہوا دروازے پر پہنچا اور کٹدی کھول دی۔

سال چھ ماہ پہلے کبھی ایسا واقعہ پیش آ جاتا تو وہ حیرت اور خوشی سے اچھل پڑتا۔ مگر اس نے نہایت متانت اور سکون سے کہا۔
”شمینہ تم؟“

”سلام“ اس نے حسب عادت ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
”ولیکم السلام“

”خدا کا شکر ہے فیاض تم ٹھیک ہو مجھے تو کسی نے تمہارے بارے میں بہت ہی ڈر دیا تھا۔“

”اندر آ جاؤ دھوپ میں کیوں کھڑی ہو۔“

”باقی سب لوگ کہاں ہیں۔“ وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھ کر پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔

”ایک شادی میں گئے ہیں دوسرے شہر“

”شاید میں غلط موقع پر آئی ہوں۔“

اس کے اندر پرانے فیاض نے سرگوشی کی۔ ”نہیں شمینہ تم بہت ہی ٹھیک موقع پر آئی ہو“ مگر نئے فیاض نے نہایت اطمینان سے

جواب دیا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ تم اطمینان سے بیٹھو۔“

”تم بہت بیمار رہے کیا؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ اب ٹھیک ہوں۔ تم کہو کب آئی ہو؟“

”پرسوں بھائی جان کے ساتھ آئی ہوں۔ مجھے کل ہی پتہ چلا کہ تم کئی ماہ تک ہسپتال میں رہے کیا ہو گیا تھا؟“

”وہی پرانی تکلیف جو پہلے بھی دو ایک بار ہوئی تھی اس بار معاملہ لمبا اور شدید ہو گیا تھا۔“

”مجھے کیوں اطلاع نہ دی؟“

”بس ایسے ہی سوچا۔۔۔۔۔ تم پریشان ہوگی۔“

”اور اگر کچھ ہو جاتا تو؟“ وہ اپنا نیت محبت اور غرور سے بولی۔

”تم کیا مجھے بچا لیتیں؟“

”ہاں کیوں نہیں۔۔۔۔۔ میں دعا کرتی تو تم بہت جلد ٹھیک ہو جاتے۔“

”اچھا؟“

”ہاں اس لئے کہ میں نے خدا سے تمہاری سلامتی کے سوا کبھی کچھ نہیں مانگا۔“

”کیا ابھی تک اکیلی ہو؟“

”یوں کیوں نہیں کہتے کہ ابھی تک اپنے عہد پر قائم ہوں۔“

”یہ ضد اچھی نہیں ہے اب بھی وقت ہے۔“

”میں تصور بھی نہیں کر سکتی فیاض“

”اب تمہیں ایسی جذباتی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

”کیوں اب کیا ہو گیا ہے؟“

”تمہیں حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے؟“

”فیاض میں نصیحتیں سننے نہیں آئی، تمہیں دیکھنے اور تمہارا حال پوچھنے آئی ہوں۔“

”اس کا بہت شکریہ“

”کیا تمہیں میرا آنا برا لگا؟“

”نہیں تو“

”کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“

”ہوئی ہے لیکن میں چاہتا ہوں یہ سلسلہ اب۔۔۔۔۔“

”فیاض تم بہت بدل گئے ہو۔“

”ہاں تمہیں بھی اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لینی چاہیے۔“

”تم وہی فیاض ہونا۔۔۔۔۔ جو ایک رات ایک اجنبی گھر میں دیوار پھاند کر گھس آیا تھا اور میرے سر ہانے آ بیٹھا تھا سب گھر

والے اس کے پاس سو رہے تھے اور ذرا سے کھٹکے سے کوئی جاگ سکتا اور تمہارا خون کر سکتا تھا مگر تم نے جان کی پروا نہیں کی تھی۔“

”ہاں احمقانہ دور سے ہر شخص گزرتا ہے۔۔۔۔۔ اسی لئے تو کہتا ہوں ایک طرف ہو جاؤ۔ اب ہم نو عمری کے جذباتی دور سے

بہت آگے نکل آئے ہیں۔“

”معلوم ہوتا ہے تم ابھی صحیح طرح سے صحت یاب نہیں ہوئے۔

”یہی سمجھ لو۔“

”اچھا میں چلتی ہوں۔“ وہ پریشان ہو کر روٹھنے کے سے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چلو میں تمہیں باہر تک چھوڑ آؤں۔“

”اس کی ضرورت نہیں تم آرام کرو۔“ وہ دکھ اور صدمے سے بولی۔

”اچھا خدا حافظ“

”خدا حافظ“ وہ زور سے دروازہ بند کرتے ہوئے باہر چلی گئی۔

ثمینہ کے چلے جانے کے بعد اسے لگا جیسے اس کے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا ہو۔ بیماری کے دوران اور اس کے کچھ عرصہ بعد وہ اسے یاد کرتا اور ایک نظر دیکھنے کے لئے ترستار ہاگر پچھلے کچھ عرصہ سے اس کے ثمینہ کے بارے میں بھی خیالات تبدیل ہو گئے تھے اور اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس کے طلسم سے رہائی پالے گا لیکن جب وہ چلی گئی تو اسے ایسا لگا جیسے کمرہ روشنی اور خوشبو سے خالی ہو گیا ہو۔

اس نے ڈرائنگ روم کے دروازے کی کنڈی چڑھائی۔ کھڑکی کا پردہ ٹھیک کیا۔ تپائی سے میز پوش پھسل کر ایک طرف سرک گیا تھا اسے درست کیا اور واپس اپنے کمرے میں آ کر پھر کتاب پڑھنے لگ گیا۔ مگر اس کا جی کتاب میں نہ لگا۔ اسے بار بار محسوس ہوتا جیسے وہ گئی نہ ہو ابھی تک ڈرائنگ روم میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو۔

کچھ دیر اسے کسی ناقابل تلافی نقصان کا احساس ہوتا رہا پھر اس نے خود کو تشفی دی کہ اس نے دل کے بجائے دماغ سے جو فیصلہ کیا ہے وہ نہ صرف اس کی ازدواجی زندگی کے لئے بلکہ خود ثمینہ کے حق میں بھی بہتر ہے۔ مگر ثمینہ جا ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے اس سے اپنی پہلی ملاقات یاد آنے لگی۔

ان دنوں وہ نیانیا یونیورسٹی سے فارغ ہوا تھا اور ملازمت کے لئے جگہ جگہ انٹرویو دیتا پھرتا تھا ایک ایسے ہی سفر میں وہ اسے اپنا تک ملی تھی۔ رات کا وقت تھا اس کی گاڑی کسی ریلوے اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ جب برابر کی ریلوے لائن پر مخالف سمت سے آنے والی ایکسپریس ٹرین آ کر کھڑی ہو گئی اور عین اس کی کھڑکی کے سامنے وہ کمپارٹمنٹ آ گیا جس میں ایک نوخیز لڑکی کھڑکی کی طرف منہ کر کے کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ ڈبے میں چند اور لوگ بھی تھے مگر سبھی سو رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ وہ اکیلی جاگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا لگا جیسے وہ لڑکی نہ ہو خوشنما اور خوشبودار پھولوں سے بھری ٹوکری ہو۔ ایک ایسی مہک تھی جو بند شیشوں سے بھی آرہی تھی۔ کمپارٹمنٹ میں بلب روشن تھا اس نے سوچا اگر بلب روشن نہ ہوتا تب بھی وہاں اتنی ہی روشنی ہوتی۔ لڑکی نے پڑھتے پڑھتے سراو پڑھا یا اور اسے اپنی طرف گھورتے دیکھا تو لمحہ بھر کے لئے پریشان ہو گئی مگر پھر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب ایکسپریس حرکت میں آئی تو دل لگی کے خیال سے اور شاید یہ سوچ کر کہ وہ اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے وہ شرارت سے مسکرائی اس کا منہ چڑایا اور اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سارا خواب سا منظر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اگلی صبح جب وہ جاگی تو اسے اپنے سامنے کی سیٹ پر بیٹھے دیکھ کر مارے حیرت اور خوف کے تقریباً چیخ پڑی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے رات بھر کی بھاگ دوڑ اور جگراتے کا سارا حال اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مخالف سمت کی ٹرین سے اتر کر اس کے پیچھے چلا آئے گا اور اس کی شرارت یا مذاق اس قدر سنگین صورت اختیار کر جائے گا۔

وہ کئی روز تک شمینہ کے شہر میں مقیم رہا اور اس کے گھر کے چکر لگا تا رہا تھا۔ اتنے دنوں کے قیام کے لئے اسے محنت مزدوری کرنا پڑی تھی کیونکہ اس کے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے۔ ایک روز وہ بوجھ اٹھائے بازار میں جا رہا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ کار میں اس کے قریب سے گزری۔ بعد میں شمینہ نے اسے بتایا تھا کہ اس روز پہلی بار اس نے اس کے لئے دل میں محبت کی تپش محسوس کی تھی اور گھر جا کر دیر تک روتی رہی تھی۔ وہ شمینہ سے شادی نہیں کر سکا تھا مگر وہ اسے کبھی بھلا نہ سکا۔ وہ اسے بھولنا چاہتا مگر زخم بھرنے لگتے تو وہ اپنی ممانی سے ملنے کے بہانے اس کے شہر میں آ جاتی اور اس کے سارے زخم ہرے ہو جاتے۔ اس کی آنکھوں میں ایسا جادو تھا اور اس کی باتوں میں ایسی خوشبو تھی کہ وہ مسحور ہوئے بغیر نہ رہتا۔ وہ پچھلے ایک برس سے اسے نہیں ملا تھا اس نے شمینہ کے آخری خط کا ابھی تک جواب نہیں دیا تھا۔ اسے تو ہسپتال میں بھی اس خیال نے بار بار پریشان کیا تھا کہ اس نے شمینہ کے ڈھیروں خط ٹھکانے نہیں لگائے تھے۔ وہ سوچتا اگر وہ اس روز مر جاتا تو اس کی بیوی یہ خطوط پڑھ کر اس کے بارے میں کیا سوچتی۔ آج بھی بیوی بچوں کے چلے جانے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ ان خطوط کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔

اچانک اسے یاد آیا کہ اس کی بیوی بچے شادی والے گھر میں پہنچ گئے ہوں گے ممکن ہے وہ اپنے پہنچنے کی اطلاع دینے کی کوشش کر رہے ہوں اس نے ایک طرف اٹھا کر رکھا ہوا ٹیلیفون کا ریسیور اپنی اصلی جگہ پر رکھ دیا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ دوسرے ہی لمحے ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی اس نے ریسیور اٹھایا تو اس کی بیوی بول رہی تھی۔

”ہم کتنی دیر سے کوشش کر رہے ہیں بڑی مشکل سے نمبر ملا ہے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ ٹیلیفون کا ریسیور آف مت کریں۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ کہو سب ٹھیک ہیں نا؟“

”ہاں سب ٹھیک ہیں، صرف پھوپھی جان خفا ہیں۔“

”کیوں؟“

”یہ آپ خود ان سے پوچھ لیں۔“

اندر کی گنگناہٹ

چند روز پہلے بھی اس نے یہی بات کہی تھی اور میں نے اسے بہت سی دوسری باتوں کی طرح سنی ان سنی کر دیا تھا۔ مگر آج صبح جب میں دفتر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا اس نے اپنی بات دہرائی۔ میں اس وقت جلدی میں تھا اسے کوئی جواب نہ دے سکا مگر منی بس میں بیٹھے اس کی بات پر غور کر کے دہل سا گیا۔ مجھے مرحومہ خالہ جان آپا پانو اور ہیڈ کلرک ہدایت اللہ یاد آنے لگے۔

خالہ جان کے بارے میں میری معلومات زیادہ وسیع نہ تھیں۔ وہ ایک دور افتادہ گاؤں میں بیاہی ہوئی تھیں ان کا میاں مردم بیزار قسم کا آدمی تھا اور سسرالی رشتہ داروں کو بالکل پسند نہ کرتا تھا۔ وہ خالہ جان کو بھی میکے جانے اور اپنے رشتہ داروں کے ملنے کی اجازت دیتا تھا۔ اور جو رشتہ دار کبھی کبھار ان کا حال احوال معلوم کرنے چلے جاتے تھے وہ ان سے بھی اچھا سلوک نہ کرتا تھا۔ اس لئے ان سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ شاید دس پندرہ برسوں میں میں نے انہیں صرف چند بار دیکھا ہوگا۔ البتہ انتقال سے کچھ عرصہ پہلے وہ اپنے میکے آگئی تھیں تب ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں جو اپنے باپ کے پاس ہی رہتی تھیں۔ شاید بیٹا پیدا نہ کر سکنے کی وجہ سے خالو ان سے ناراض رہتے تھے۔ پھر انہوں نے زیادہ وقت اپنی ایک بیوہ بھالو کے ہاں گزارنا شروع کر دیا۔ میں جب آخری بار ناناجی کے ہاں خالہ سے ملا وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ ان دنوں وہ تقریباً ہر وقت نماز پڑھتی رہتی تھیں۔ مصلے سے اٹھا کر کوئی ان کو ادھر ادھر لے جاتا تو چند ہی لمحوں بعد وہ یہ کہہ کر دوڑ پڑتیں۔ ”ہائے میری نماز قضا ہو رہی ہے۔“

نماز پڑھتے ہوئے انہیں دو رکعات اور سجدوں کی گنتی بھول جاتی تھی۔ ایک رکعت میں کئی کئی سجدے دیتیں اور بار بار انہیں سجدہ سہو پڑ جاتا۔ نماز کے علاوہ وضو کرنا اور ہاتھ پاؤں دھوتے اور پاک کرتے رہنا ان کی دوسری بڑی مصروفیت تھی۔ ناپاکی کا احساس ان کے ذہن پر ایسا سوار تھا کہ کوئی چھو بھی دیتا یا کوئی نجس جانور دور سے نظر آ جاتا تو ان کے کپڑے پلید ہو جاتے نہ جانے انہوں نے کس قسم کی زندگی گزاری تھی۔ ان پر کیا بیٹی تھی اور کیا حادثہ پیش آیا تھا کہ اتنا نہانے دھونے اور صابن رگڑنے کے بعد بھی وہ پاک نہ ہو چکتی تھیں۔ ان کا ذہنی توازن قائم نہ رہا تھا اگر انہیں کسی بات کا ہوش تھا تو اپنے تن بدن کا۔ محال ہے دوپٹہ سر سے ڈھلکنے دیتیں یا کسی غیر مرد کی نگاہ اپنے بدن پر پڑنے دیتیں۔ اب تو خیر ان کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ مگر میں نے جب انہیں اپنے بچپن میں دیکھا وہ بہت خوبصورت تھیں۔ امی کہا کرتی تھیں کہ وہ تو کسی اور ہی دنیا کی مخلوق تھی۔ پتہ نہیں ہمارے گھر میں کیسے پیدا ہو گئی تھی۔

مجھے یاد ہے جب چھوٹا سا تھا تو وہ ایک بار ہمارے ہاں میری بیمار والدہ کی خبر گیری کے لئے آئی تھی اور جب بھی اکیلی ہوتی تھیں اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی تھیں۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ سنوں وہ کیا باتیں کرتی ہیں مگر ان کی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے کئی بار والدہ کو انہیں یاد کر کے اداس ہوتے دیکھا جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ خالہ اپنے گھر میں خوش نہیں تھیں۔ مگر میں ان کے دکھ کی صحیح نوعیت نہ جان سکا۔ پھر جب وہ ناناجی کے پاس آ گئیں تو میں انہیں دیکھنے کئی بار گیا وہ اب بھی اکیلے میں زیر لب کچھ پڑھتی یا بڑبڑاتی رہتی تھیں۔ ان کے سونے جاگنے کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ سوتے میں بھی بلیوں اور کتوں کو دھتکارتی اور بڑبڑاتی رہتیں۔ مگر ان کی کوئی بات ٹھیک طرح سے سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ان کا انتقال ہوا تو مجھے افسوس سے زیادہ سکون کا احساس ہوا۔

بانو میری تایا زاد بہن تھی مجھ سے کئی سال بڑی۔ وہ بھی بہت حسین اور نرم و نازک سی تھی۔ شاید خوبصورت لوگ ہی زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ بھی بہت جلد غصے میں آ جاتی۔ بہت جلد من جاتی چھوٹی سی بات پر کھلکھلا کر ہنسنے لگتی اور ذرا سی ناپسندیدہ بات ہو جاتی تو بلک بلک کر رونے لگتی۔ چونکہ اس کا کوئی سگا بھائی نہیں تھا اس لئے مجھ سے بہت پیار کرتی تھی جس روز میں ان کے ہاں کھیلنے نہ جاتا وہ اداس اور پریشان ہو جاتی اور میرے لئے طرح طرح کی چیزیں اور کھلونے لے کر ہمارے گھر آ جاتی۔ جن دنوں ہمارے گھروں کے تعلقات خراب ہوتے، ہمیں ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے سے منع کر دیا جاتا مگر ہم چھپ کر مل لیتے۔ وہ پگھٹ سے پانی بھرنے جاتی تو میں بھی وہاں پہنچ جاتا یا وہ چھٹی کے وقت مدر سے کے باہر کھڑی ہو جاتی۔ اکثر میرے لئے کھانے کی چیزیں پکاتی یا تلاش کرتی رہتی۔ میں ان دنوں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا جب آپا کا رشتہ طے ہوا۔ مجھے یاد ہے میں اس کی مگنی کی خبر سن کر خوشی خوشی اس کے گھر پہنچا تو وہ مجھے لپٹا کر دیر تک روتی رہی۔ میرا خیال تھا اسے اپنے ابا کا گھر چھوڑنے اور مجھ سے دور چلے جانے کا صدمہ تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

”آپا۔۔۔۔۔ میں تمہیں وہاں بھی ملنے آیا کروں گا۔ ابا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے ساتویں جماعت میں چڑھتے ہی بائیکل لے دیں گے۔۔۔۔۔ بس دو تین سال کی تو بات ہے۔“

اس نے مجھے پیار کیا اور روتے ہوئے بولی ”پتہ نہیں میں اس وقت کہاں ہوں گی میرے ویر“

اس وقت تو میں اس کی بات نہیں سمجھ سکا تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ اس کے رشتے کی بات پہلے اس کے ماموں زاد سے چلی تھی اور وہ بہت خوش تھی۔ مگر پھر برادری میں ایک قتل ہو گیا اور بہت سے رشتے ناتوں کی اکھاڑ پچھاڑ ہو گئی اور اب جہاں اس کی شادی ہونے

والی تھی وہ ایک بد صورت گنوار سا آدمی تھا۔ اور اگرچہ اس کے پاس ضرورت کے مطابق کافی اراضی تھی مگر اس کا اپنا آدھا دھڑ پیداہشی طور پر سوکھا ہوا تھا۔

مجھے یاد ہے مگنی کے ایک سال بعد جب آپا بانو کی شادی ہوئی تو اسے بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ اس نے منع کر دیا کہ جب تک وہ مجھ سے نہیں مل لیتی اپنی ڈولی نہیں اٹھانے دے گی۔ میری ڈھونڈ یا پڑی میں اس وقت اپنے ایک ہم عمر کے ساتھ کیکر کے قریبی درختوں پر چڑھ کر گوند اتارنے میں مصروف تھا۔ مجھے درخت سے اتار کر اس کے پاس لایا گیا۔ وہ مجھے لپٹا کر اتنی دیر تک روتی رہی کہ سب پریشان ہو گئے کیونکہ بارات کو بہت دور جانا تھا اور دیر ہو رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے مجھے اس سے الگ کیا گیا۔

اس کے چھ ماہ بعد ایک دن مجھے پتہ چلا کہ آپا سخت بیمار ہے اور مجھے یاد کرتی ہے۔ والدہ صاحبہ کا ارادہ تھا میری دسبر کی چھٹیوں میں مجھے اس کے پاس لے چلیں گے مگر وہ چھٹیوں سے پہلے خود ہی میکے آ گئی۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی اس کا چہرہ کملا گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر رونے لگی مگر مجھے اپنے قریب آنے منع کر دیا۔ مبادا اس کی بیماری مجھے لگ جائے۔ میں روزانہ اس سے ملنے جاتا اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ مگر وہ میرے بجائے خود سے باتیں کرتی رہتی اسے بار بار کھانسی اٹھتی اور وہ قریب رکھی انگلیٹھی میں خون آلود بلغم تھوکتی رہتی۔

اب میں ہائی سکول میں داخل ہو گیا تھا اور بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا۔ میری چھٹیاں ختم ہوئیں تو میں شہر چلا گیا۔ ایک دن گاؤں سے ایک آدمی آیا مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے بتایا کہ آپا آخری وقت میں بھی مجھے پکارتی اور یاد کر کے روتی رہی تھی۔ میں گاؤں پہنچا تو اس کی آخری خواہش کے مطابق میرے انتظار میں اس کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔

جہاں تک ہدایت اللہ ہینڈ کلرک کا تعلق ہے اس کا انتقال گزشتہ برس ہوا وہ عمر میں مجھ سے چند سال بڑا تھا اور تقریباً تین سال سے میرے ماتحت کام کام رہا تھا۔ اس کا قد لمبا اور صورت اچھی تھی اگر کبھی وہ صاف ستھرا اور اچھا لباس پہن کر آتا جو وہ بہت کم پہنتا تھا اور میرے سامنے بیٹھ جاتا تو پتہ چلانا مشکل ہو جاتا کہ افسر کون ہے اور ماتحت کون۔ اسے خالہ جان یا آپا بانو کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت یا بیماری بھی نہیں تھی۔ البتہ وہ جب بھی میرے پاس آتا گنگنار ہا ہوتا۔ شروع شروع میں مجھے غصہ آتا میں اسے کوئی کیس لے کر آنے کو کہتا تو وہ اچھا جی کہہ کر گنگناتا ہوا چلا جاتا پھر جب کاغذات لے کر آتا تو ہر بار سلام کرتا اور گنگناتا لگتا۔ فائل کھول کر مجھے کیس کے بارے میں بتاتا اور جب میری بولنے کی باری آتی گنگناتا لگتا۔ یہ گنگناہٹ عام گنگناہٹ سے قدرے مختلف ہوتی۔ اس کے ہونٹ تو ہمیشہ بند ہوتے، نتھنے بھی نہ پھڑکتے بلکہ شاید اسے پتہ ہی نہ چلتا کہ وہ گنگنار ہا ہے کچھ عرصہ تو میں ضبط

کرتا رہا پھر اسے دو تین بار ٹوکا تو وہ حیران ہوا۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”سر میں ایسی گستاخی کیسے کر سکتا ہوں کہ آپ بات کر رہے ہوں تو میں خاموشی اور توجہ سے سننے کی بجائے گنگنا نے لگوں۔“ یہ کہہ کر وہ پھر گنگنا نے لگتا۔

پھر آہستہ آہستہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتا یہ گنگنا ہٹ کہیں اس کے بہت اندر خود بخود ہوتی رہتی ہے۔ جس کی اس کو بھی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ ویسے بھی یہ گنگنا ہٹ اتنی مدہم اور بے ضرری ہوتی تھی کہ عام طور پر کسی کو اس کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔

میں نے دل میں اس کے لئے ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اس کے نجی حالات معلوم کرنا چاہے مگر ہمارے درمیان عہدے اور درجے کا جو فرق تھا وہ رکاوٹ بن گیا۔ تاہم پی اے سے مجھے معلوم ہوا کہ ہدایت اللہ کی بیوی اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ پڑھی لکھی اور خوبصورت عورت ہے ان کا ایک پیارا سا بچہ بھی ہے اور ہدایت اللہ بھائی بہنوں کی شادیوں کے فرائض سے عہدہ برآ ہو چکا ہے۔ ایسے حالات میں بظاہر کوئی وجہ ایسی نظر نہ آتی تھی جس سے اندازہ ہو سکتا کہ وہ ذہنی یا جذباتی طور پر پریشان ہے یا اس کے دل و دماغ پر کسی قسم کا بوجھ یا دباؤ ہے۔ دفتر میں بھی روٹین کا کام تھا اور وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہا تھا۔ ہاں اسے اکثر بھول جانے کی بیماری تھی۔ نہایت ارجنٹ اور موسٹ امپارٹنٹ قسم کی چٹھی ڈسپینچ کرانے کی بجائے دراز میں رکھ دیتا یا نہایت ضروری کیس پٹ اپ کرنا بھول جاتا۔

ایک روز سیکشن سے شور سنائی دیا۔ میں نے نائب قاصد کو بلا کر معلوم کرنا چاہا مگر بار بار گھنٹی بجانے پر بھی وہ اندر نہ آیا غالباً اسی شور کی وجہ سے اسے گھنٹی کی آواز سنائی نہیں دی تھی یا کوئی جھگڑا ہو رہا تھا جس میں وہ خود بھی ملوث تھا۔ جب کچھ دیر کے توقف کے بعد بھی گھنٹی بجانے پر سٹاف کا کوئی آدمی یا نائب قاصد اندر نہ آیا تو میں اٹھ کر سیکشن کے طرف آیا۔ دروازہ بند تھا اور اندر سے کسی عورت کے لڑنے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرے سیکشن میں دو لڑکیاں ماتحت کلرک کے طور پر کام کرتی تھیں اور ان کی سہیلیاں یا دوسرے شعبوں کی لڑکیاں بھی ان کے پاس آتی جاتی تھیں۔ ضرور کسی لڑکے نے کوئی بد تمیزی کی ہوگی۔ میں دروازہ کھول کر اصل حالات معلوم کرنا چاہتا تھا مگر مجھے یہ مناسب معلوم نہ ہوا کہ سٹاف کے کسی جھگڑے میں اس طور پر شرکت اور دخل اندازی کروں۔ آخر مقدمہ تو میرے ہی پاس آئے گا۔ پھر شیر اپنے کچھار میں شیر ہوتا ہے۔ میں اس خیال سے واپس اپنی سیٹ پر آ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ نائب قاصد یا ہیڈ کلرک مجھے آ کر سب حالات بتائیں۔

بعد میں پتہ چلا کہ ہدایت اللہ کی بیوی دفتر آئی تھی۔ دونوں میں گھریلو معاملات پر جھگڑا ہوتا رہا وہ کہیں جانا چاہتی تھی اور ہدایت اللہ اسے اجازت دیئے بغیر گھر سے نکل آیا تھا۔ دونوں میں دفتر میں بھی جھگڑا ہوتا رہا اگرچہ ہدایت اللہ کا رویہ نرم تھا مگر وہ بگڑتی چلی گئی

اور چنچنی چلاتی روتی دھوتی گھر کی چابیاں پھینک کر پلے کو ساتھ لے کر میکے چلی گئی۔ سٹاف کے آدمیوں نے صلح صفائی کی بہت کوشش کی مگر وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی چونکہ ہدایت اللہ کا اس میں کوئی قصور نہ تھا اور نہ ہی اس نے اپنی بیوی کو دفتر میں آ کر شور و غل کرنے اور جھگڑا کرنے کو کہا تھا اس لئے میں نے وضاحت طلب کرنا یا اسے وارننگ دینا مناسب خیال نہ کیا بلکہ میں ایسے خاموش ہو گیا جیسے مجھے کسی بات کا علم نہ ہو۔ اب خیال آتا ہے کہ کاش میں اسے اپنا ماتحت سمجھنے اور دفتری ضابطوں کا خیال رکھنے کے بجائے اسے اپنے برابر کا ایک انسان سمجھ کر پیش آتا تو شاید وہ حادثہ رونما نہ ہوتا جو وقت گزر جانے کے بعد میرے لیے بھی پشیمانی کا سبب بنا۔

ہوا یوں کہ ایک روز ہدایت اللہ کی عرضی آئی کہ وہ بیوی بچوں کو لینے لاہور جانا چاہتا ہے اس لئے مہربانی کر کے اسے تین دن کی رخصت اور اسٹیشن چھوڑنے کی اجازت دی جائے۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہوا کہ ضرور اس کی اپنی بیوی سے صلح ہو گئی ہو گی مگر چوتھے روز اس کی بجائے تار آیا کہ اس کی چھٹی ایک ہفتے کے لئے بڑھادی جائے کیونکہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ پہلے تو مجھے خیال آیا کہ ہدایت اللہ کی بیوی سے صلح ہو گئی ہے۔ اس لئے اب اس نے سیر سپاٹے اور سسرال کی میزبانی کا لطف اٹھانے کے لئے بہانہ کیا ہے۔ لیکن پھر ہدایت اللہ کا سابقہ ریکارڈ ذہن میں آیا۔ وہ جھوٹ نہیں بولا کرتا تھا نہ ہی بہانے بازی کا عادی تھا۔ ممکن ہے وہ بیوی کو لانا چاہتا ہو اور وہ مانتی نہ ہو کیونکہ جیسا مجھے بتایا گیا تھا اس کی بیوی ایسے لوگوں میں سے تھی جو چیخ چلا کر بات کرتے اور رو دھو کر جی ہلکا کر لیتے ہیں مگر ہدایت اللہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کرنے کا عادی تھا ضرور کسی روز اس کا دل بیٹھ جائے گا۔ یاد ماغ کی کوئی شریان پھٹ جائے گی۔ بہر حال میں نے اس کی چھٹی منظور کر لی۔

جب چھٹی ختم ہوئے بھی تین روز اوپر ہو گئے تو مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ یہاں دفتر کا ڈھیروں کام پڑا تھا اور وہ سسرال کی میزبانی کے مزے لوٹ رہا تھا اور عین اس وقت جب میں اسے جلد واپس آ کر رپورٹ کرنے کی ڈکٹیشن دے رہا تھا۔ ٹیلیفون کے ذریعے اطلاع ملی کہ ہدایت اللہ سب سے بڑے باس کے پاس پہنچ گیا ہے اور اب کوئی نوٹس اس تک نہیں پہنچ سکتا۔

ہدایت اللہ کے واجبات کے سلسلے میں کئی ماہ تک اس کا سالانہ دفتر کے چکر لگاتا رہا اگرچہ اس سے کچھ پوچھنا بیکار تھا پھر بھی اس سے ذرا بے تکلفی ہوئی تو اس نے بتایا کہ میاں بیوی کے تعلقات شروع دن سے ناخوشگوار چلے آتے تھے۔ اس نے بتایا کہ اس کی بہن نسبتاً زیادہ پڑھی لکھی تھی اور بہتر ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ اپنے کسی کلاس فیلو سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر قریبی رشتہ داری کی وجہ سے بزرگوں نے اس کی مرضی کے خلاف ہدایت اللہ سے اس کی شادی کر دی۔

چند ماہ بعد واجبات کا چیک تیار ہو گیا تو عدت ختم ہو جانے کے بعد ہدایت اللہ کی بیوی ایک دن دفتر آئی۔ میں نے نائب قاصد

سے کہا کہ وہ اسے میرے کمرے میں لا کر تعظیم سے بٹھائے اور کافی تیار کرے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آئی تو میں اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔

”پروین تم؟“

”جاوید تم؟“ وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

اور آج میری بیوی نے دوسری مرتبہ مجھ سے پوچھا ہے کہ یہ میں اندر ہی اندر کیا بولتا گنگنا تارہتا ہوں اور اس کی بات پر غور کر کے میں دہل سا گیا ہوں کہ کیا میں بھی؟



اور سر کے بال کوئی بھی چیز میری نہ تھی البتہ ایک سیاہ تل بہت مانوس دکھائی دیتا تھا۔ جیسے کوئی سوتے میں میرا دکھتا ہوا چہرہ چرا کر لے گیا ہو اور اس کی جگہ جھریوں اور سفید بالوں والی گردن میرے کندھوں پر لگا گیا ہو۔

مگر یہ تل؟۔۔۔۔۔ شاید مجھے دھوکہ دینے کے لئے کسی نے عین اسی جگہ داہنے گال کے نیچے چپکا دیا تھا جہاں میں اسے دیکھنے کا عادی تھا۔ میں نے رومال سے چہرے کو زور زور سے رگڑا اور تل کو صاف کرنا چاہا مگر لگتا تھا اسے کسی عمدہ قسم کے سلیوشن سے لگایا گیا تھا۔ پردیس میں اپنا چہرہ چوری ہو جانے سے میں بہت پریشان ہوا۔ اس سے کئی طرح کی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں میں نے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ سے آئینے میں نظر آنے والے چہرے کا موازنہ کیا اور سخت گھبرا گیا۔ میں نے کہا۔ ”یہ چہرہ ہرگز میرا نہیں ہے۔“

”تم ناحق پریشان ہو رہے ہو یہ تمہارا ہی چہرہ ہے۔“

”کمال کرتی ہو کیا میرے چہرے کو نہیں پہچانتی ہو؟“

”پہچانتی ہوں اسی لئے تو کہہ رہی ہوں۔“

”تو کیا یہ وہی چہرہ ہے جسے تم پہچانتی ہو؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ یہ بالکل وہی تو نہیں مگر میں سمجھتی ہوں اتنے برسوں میں کافی تبدیلی آ سکتی ہے۔“

”تبدیلی ضرور آئی۔ آئی بھی چاہیے۔ مگر میں اپنے چہرے کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ ہر روز دیکھتا ہوں مجھے مغالطہ نہیں ہو سکتا۔“

”تم نے صبح شیو بھی تو کی تھی۔“

”ہاں میں نے شیو کی تھی مگر بہت جلدی تھی۔ میں نے غور نہیں کیا۔ البتہ رات کو جب میں ٹوتھ برش کر رہا تھا آئینے پر نظر پڑی تھی اور وہ میرا اپنا چہرہ تھا۔“

”ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اگر ایسا ہوا ہے تو تمہارا چہرہ کہاں گیا۔ کون لے گیا؟“

”یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”مجھے ہوٹل کا بیرایا دیا۔ پھر مینجر۔۔۔۔۔ اور وہ پراسرار شخص بھی جولابی میں بیٹھا رہتا تھا اور مجھے عجیب مشکوک نظروں سے گھورتا رہتا تھا۔“

”گاڑی روکو۔“ میں نے تقریباً چلا کر کہا۔ ”میرا چہرہ پیچھے رہ گیا ہے شاید کسی سے بدل گیا ہے۔“

سب لوگ پلٹ پلٹ کر مجھے دیکھنے لگے پھر ساتھ والی سیٹ کے سردار جی نے اپنا چہرہ ہاتھ میں لے کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔
 ”اے پسند ہے تے آپاں نال بدل لوؤ۔“

اس پر ہر طرف سے قہقہے سنائی دینے لگے مجھے اپنی حرکت پر شرمندگی ہو رہی تھی۔ پچھلی سیٹ سے ایک بڑے میاں نے سرد آہ بھری اور بولے۔ ”چہرہ تو میرا بھی بہت پیچھے رہ گیا ہے۔“
 ”تسیں وی بدل لو جی۔“ سردار جی نے ایک کالے موٹے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”ان کے ساتھ۔“

ایک بار پھر قہقہے گونجنے لگے۔ کالے کلوٹے شخص کے چہرے پر درشتی کے آثار نمودار ہوئے مگر دوسرے ہی لمے اس کی پیشانی کی سلوٹیں خود بخود ہموار ہو گئیں۔ کسی مسکراتے ہوئے خیال کے زیر اثر وہ بولا۔
 ”ہاں جی بدل لیں۔۔۔۔۔۔ بے شک مفت لے لیں۔ میں آگرہ جا کر ماربل کا نیا بنوا لوں گا۔“
 سب لوگ ہنسنے لگے۔

”یہ مہمان ہیں اور شاید پریشان ہیں۔“ ادھیڑ عمر کا ایک سنجیدہ چہرے والا شخص بولا ”آپ لوگ ان کا مذاق نہ اڑائیں۔“
 ”لہوروں آئے او؟“ سردار جی نے پوچھا۔
 ”ہاں جی۔“

”جی آیانوں۔۔۔۔۔۔ سرمٹھے تے۔“
 ”شکریہ“

”چھما کر ناویر جی“ سردار جی ہاتھ جوڑ کر بولے ”مذاق کا برا نہ منانا“
 ”کوئی بات نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”کوئی پریشانی ہے صاحب؟“ سنجیدہ چہرے والا ادھیڑ عمر بولا۔
 ”ہاں نہیں۔ بس یونہی کچھ یاد آ گیا تھا۔“

اسی لمحے ٹیلی ویژن پر فلم شروع ہو گئی اور سب لوگوں کی نظریں سکرین پر لگ گئیں۔ ہیرو مین ایک شاپنگ سنٹر میں داخل ہوئی۔ سیلز مین اسے رنگ برنگی ساڑھیاں دکھانے لگا۔ میں بھی چپکے سے اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نیلے گنبد کی طرف انارکلی میں آ گیا اور وہ

دکان تلاش کرنے لگا جس کے شوکیس میں تاج محل کا ماڈل دیکھ کر اس نے خرید لینا چاہا تھا مگر میں نے منع کر دیا تھا اور کہا تھا ”یہ میں تمہیں سالگرہ میں دوں گا۔“

وہ کچھ دیر کھڑی سوچتی رہی تھی پھر اس نے کہا تھا۔ ”تمہیں تکلیف ہوگی۔“

”مجھے بہت خوشی ہوگی۔“

”مجھے بہت خوشی ہوگی۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا تھا ”تم لا دو گے تو اس کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔“

جلد ہی مجھے وہ دکان مل گئی۔ قیمت طے ہو چکی تھی۔ میں نے جاتے ہی پیک کرنے آرڈر دے دیا مگر جب میں پیک کیا ہوا منی تاج محل لے کر دکان سے باہر آ رہا تھا سیڑھیوں پر میرا پاؤں رٹ گیا اور ڈبہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر گر گیا۔ یقیناً وہ چکننا چور ہو گیا تھا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ دکاندار بھی کاؤنٹر چھوڑ کر باہر آ گیا اس نے ازراہ ہمدردی سلیوشن وغیرہ سے جوڑنے کی پیش کش بھی کی مگر میں اس قدر شرمندہ اور بدحواس ہو رہا تھا کہ جلدی جلدی وہاں سے نکل آیا۔ مجھ میں ڈبہ کھول کر دیکھنے کی ہمت تھی نہ دوسرا ماڈل خریدنے کی استطاعت۔ پھر اگر وہ سلیوشن سے جڑ بھی جاتا تو بھی تحفے میں نہ دیا جا سکتا تھا۔ خصوصاً اے۔۔۔۔۔ جو ذرا ساداغ یا پیوند بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ چیزوں میں بھی اور جذبوں میں بھی۔ گھر آ کر میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈبہ کھولا وہ بچ چکننا چور ہو گیا تھا اور اگرچہ اوپر کار میانی گنبد مع محرابوں اور دروازوں کے سلامت تھا مگر نیچے کا چوترا جو درمیانی حصے اور میناروں کی بنیاد کا کام دیتا تھا، جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ایک مینار کے دو اور دوسرے کے تین ٹکڑے ہو گئے تھے اور چوتراے یا پلیٹ فارم کے سامنے اطراف کی جالیاں اتنے بہت سے ٹکڑوں اور کرچیوں میں تقسیم ہو گئی تھیں کہ ان کی اصل جگہ معلوم کرنا اور جوڑنا آسان نہ تھا۔ میں نے کانغذ کی کترئیں بھر کر دوبارہ اسے پیک کر دیا اور ڈبہ اٹھا کر چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔ کافی دیر تک میں تنگیے پر سر رکھ کر سوچتا رہا، سمجھ نہ آتا تھا کیا کروں سالگرہ میں جاؤں نہ جاؤں۔ جاؤں تو کیا لے کر جاؤں اور نہ جاؤں تو کیا بہانہ بناؤں۔ اسی دوران میں ایک مصرعہ سوجھ گیا جو میری اس وقت کی کیفیت کی بڑی اچھی عکاسی کرتا تھا تھوڑی سی اور کوشش کی تو دوسرا مصرعہ بھی ہو گیا۔ اب کیا تھا میں اسے تحفے میں دینے کے لئے نظم لکھنے بیٹھ گیا۔

وہ میری مشق سخن کا ابتدائی دور تھا۔ نظم شاید فی اعتبار سے بہت اچھی نہ تھی مگر نہایت حسب حال تھی اس میں تاج محل خریدنے کے لئے میں نے جو فاقے کئے تھے اور نام لگایا تھا اور کچھ کتابیں بچی تھیں ان سب باتوں کا بھی ذکر تھا اور اس کے گر کر ٹوٹنے کا احوال بھی۔ اس کے ٹوٹنے کا جواز ذرا شاعرانہ انداز میں بتایا گیا تھا کہ وہ اس کے حسن و جمال کی تاب نہ لا سکتا تھا اس لئے سامنا کرنے

سے پہلے ہی ٹوٹ گیا اور ایک بڑی ندامت سے بچ گیا۔

نظم اسے اتنی پسند آئی کہ تاج محل بھول گئی۔ بلکہ اگلے روز کہنے لگی۔ ”اچھا ہوا ٹوٹ گیا ورنہ تم اتنی عمدہ نظم کیسے لکھتے۔“

اس نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ اچھا ہوا تاج محل ٹوٹ گیا مگر تیسرے چوتھے روز صبح سویرے ہی آگئی۔ اور کہنے لگی ”مجھے وہ ماڈل دے دو۔“

”اس کا کیا کرو گی؟ بالکل ہی ٹوٹ گیا ہے بیکار ہو گیا ہے۔“

”میری چیز ہے جیسی بھی ہے بس مجھے دے دو۔“

”اچھا میں ویسا ہی دوسرا لا دوں گا۔“

”جی نہیں۔۔۔۔۔ مجھے یہی چاہیے میں لے کر جاؤں گی۔“

میں نے ڈبہ اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ میں نے کہا ”کاش میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں پتھر کی بجائے سونے کا تاج محل لا دیتا۔“

”مجھے سونے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم خواہ مخواہ غریبوں کی محبت کا مذاق اڑاتے۔“

”میں تمہیں سونے میں تول کر سارا سونا غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔“

”ہائے نہیں۔۔۔۔۔ تمہیں پتہ ہے میرا وزن کتنا ہے؟“

”کتنا ہے؟“

”پورے پچاسی پاؤنڈ“

”مجھے تو لے ماشوں میں بتاؤ۔“

”تمہیں پتہ ہے میں حساب میں کمزور ہوں۔“

”سردار جی۔۔۔۔۔ یہاں آپ کے ہاں سونے کا کیا بھاؤ ہے؟“ میں نے پوچھا

”کس کے ساتھ؟“ سردار جی نے قہقہہ لگایا۔

”سونا۔۔۔۔۔ گولڈ“

”شہیت تین ہزار ایک تو لے گا۔“

میں نے چاہا پونڈوں کے تولے بنا کر ان کو تین ہزار سے ضرب دوں مگر اسی لمحے عزیز مصر کی سواری آ گئی۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔

بردے کی صنعتیں بیان کرنے والا دلال چبوترے سے اتر آیا۔ محلوں میں بیٹھ کر بولی لگواتی بیگمات پریشان ہو گئیں۔ مول تول کرتے بیوپاری چپ ہو گئے۔ بادشاہ کے مقابلے میں کون بولی دے سکتا تھا۔

”نیلام جاری رہے۔“ بادشاہ نے دلال کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ آداب بجالایا اور دوبارہ چبوترے پر چڑھ کر پکارا۔

”ہے کوئی خریدنے والا۔۔۔۔۔ ایک حسین لطیف اور خوش طبع عبرانی غلام کو جس کی نظیر دنیا میں نہیں۔“

”ہمارے سوا اسے کون خرید سکتا ہے۔“ بادشاہ نے پر جوش آواز میں کہا۔ ”مالک سے پوچھو کیا مانگتا ہے۔ ہم اسے ہر قیمت پر

خریدنا چاہتے ہیں۔“

چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

مالک ہجوم کو پیچھے ہٹاتا آگے آیا۔ تعظیم کے بعد بولا ”جان کی امان پاؤں تو عرض کروں؟“

”امان دی۔ تم عرض کرو۔“

”عالی جاہ۔۔۔۔۔ کیا مجھے اس کے ہم وزن سونا عطا ہو سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں؟“ بادشاہ نے بردے کی طرف ایک نظر دیکھ کر کہا۔ ”ہمارے خزانوں کے مقابلے میں اس کا وزن ہی کتنا ہے؟“

وزیروں کو حکم ہوا۔ شاہی خزانہ لایا جائے اور ایک بڑے ترازو کا انتظام کیا جائے۔ آن کی آن میں شاہی حکم کی تعمیل ہو گئی۔ ترازو

لایا گیا۔ مسلح پہریداروں کی نگرانی میں سروں پر زرد جواہرات کے بڑے بڑے ٹشت اٹھائے باوردی غلام حاضر ہو گئے۔ نو عمر

پڑمرہ اور غریب الدیار بردے کو ایک پلڑے میں بٹھا دیا گیا۔ دوسرے پلڑے میں سونے کے خالص مہروں اور جواہرات سے

بھرے ٹشت لٹائے جانے لگے۔ خلقت دم بخود رہ گئی جب باری باری سارے ٹشت خالی ہو گئے مگر بردے والا پلڑا زمین سے نہ

اٹھ سکا۔ خازن کو پسینہ آ گیا۔ امیر وزیر انگشت بدنداں نظر آنے لگے۔ بادشاہ پریشان ہو گیا۔ بولا۔۔۔۔۔ ”یہ برکت والا نازک

اندام غلام ہمیں دے دو۔ ہم شرط ہار گئے۔ ہم اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ اسے محل میں لایا گیا۔ مشک و عنبر سے نہلایا اور اطلس و

کنو اب کی پوشاک پہنائی گئی۔ اور مصر شہر کی ملکہ اس کے ناز اٹھانے کے لئے ایک ادنیٰ کنیز کی طرح اس کی خدمت میں حاضر رہنے

لگی۔

اس نے ٹوٹے پھوٹے تاج محل کی مرمت کروالی۔ اور اسے جھاڑ پونچھ کر ایک ایسی بلند جگہ پر رکھوا دیا جہاں اسے کوئی چھونہ سکے اور وہ دیکھنے میں سلامت نظر آئے۔ کہنے لگی۔ ”میں اسے کبھی خود سے جدا نہ کروں گی۔“

مگر کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اتنا ہی جتنا اصلی تاج محل اور اس کے رپلیکا میں۔ وہ ماڈل اسی جگہ پڑا رہ گیا اور وہ اسے چھوڑ کر کہیں اور چلی گئی۔ شاید کسی بڑے اور اصلی تاج محل میں۔ اور میرا حال اس ماڈل کا سا ہو گیا جو دیکھنے میں سالم نظر آتا مگر ذرا سے چھونے سے اس کی ٹکڑے الگ ہو جاتے۔

”کیہ گل اے ویر جی؟“ سردار جی میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے پوچھا۔ ”آپ روکیوں رہے ہیں؟“

”نہیں تو“ میں نے جلدی سے آنکھیں صاف کر کے جواب دیا۔ ”شاید مجھے زکام ہو رہا ہے۔“

سردار جی شاید کچھ اور بھی پوچھتے مگر فلائنگ کوچ ایک مڈوے ریسٹوران کے احاطے میں داخل ہو کر رک گئی۔

دھوپ اب خوب چمک رہی تھی۔ دھند اور غبار بھی چھٹ گیا تھا ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ گرم گرم چائے اس وقت بہت اچھی لگی۔

تھوڑی دیر بعد کوچ دوبارہ روانہ ہوئی تو سڑک کے کنارے ایک جگہ سوروں کا ریوڑ دکھائی دیا۔ میرے اندر محمد یونٹا گجراتی اپنی سی حرفی گنگنانے لگا۔

”خوک چار دے بوٹیا عشق پچھے کئی ولی کمال سدان والے“

سردار جی نے سوروں میں میری دلچسپی کو بھانپتے ہوئے پوچھا۔

”ادھر نہیں ہوتے؟“

”ہوتے ہیں مگر کھیتوں اور جنگلوں میں چھپ کر رہتے ہیں۔“

”یہاں تو بہت ہیں پالے جاتے ہیں۔“

”ہمارے ہاں خود پلتے ہیں، کھیت اور فصلیں اجاڑ دیتے ہیں۔“

”یہ ہر جگہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ سنا ہے آپ کے ہاں تو یہ گالی ہے۔“

”ہاں، ہمارے ہاں ان کا نام نہیں لیا جاتا۔ ان کو باہر لایا یعنی باہر والا کہتے ہیں۔“

”باہر والا کیوں کہتے ہیں؟“

”سور یا خنزیر کہے سے زبان پلید ہوتی ہے۔“

سردار جی کسی بچے کی طرح کھلکھلا کر ہنسے۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے سردار جی؟“

”آپ کی زبان پلٹ ہو گئی۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔ ”میں اترکلی کر لوں گا۔“

”ویسے ویر جی“ سردار جی اچانک سنجیدہ ہو گئے۔ ”اس کو اندر والا کہنا چاہیے۔“

”اندر والا؟“

”ہاں دنیا میں ہر کہیں ساری گڑ بڑ اسی اندر والے کی وجہ سے ہے۔“

”آپ نے ٹھیک کہا۔“

”اب دیکھو نا جی، ادھر بھی یہی حرام زادے آپ کی فصیلیں اجاڑتے ہیں اور ادھر بھی۔ کھا کھا کر پھٹ گئے ہیں۔“

فلاننگ کوچ سکندرہ میں اکبر اعظم کے مقبرے پر تھوڑی دیر رک کر آگرہ شہر میں داخل ہوئی تو فرط جذبات سے اس کا چہرہ متمنا نے لگا مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں بھی چپ تھا مگر میرے اندر کھلبلی سی مچ گئی۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ پتہ نہیں کیا ہونے والا تھا۔ پتہ نہیں کتنی دیر ہم اس ڈیوڑھی کی سیزھیوں پر کھڑے رہے جہاں سے پورا تاج محل نظر آتا ہے اور پہلی ہی جھلک میں ہر دیکھنے والے کو مسحور کر دیتا ہے۔

کہنے لگی۔ ”وہ ہزاروں معمار، مزدور، سنگتراش اور نگران عملے کے لوگ جو بیس بائیس برسوں تک یہاں کام کرتے اور اپنے ہاتھوں

سے اسے اسارتے رہے یقیناً انہوں نے بھی محبت کی ہوگی ان کی اپنی اپنی ممتاز محل ہوں گی۔“

”ہاں“ میں نے جواب دیا۔ ”شاید ان میں سے بہت سوں نے اپنی اپنی ممتاز محل کو یہاں دفن بھی کر دیا ہو۔“

”مجھے بھی تم۔۔۔۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں نے اپنی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھی اور خوفزدہ ہو گیا پھر جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر سیزھیاں اتر گیا۔ ہم نے تاج محل کے سامنے حوضوں، فواروں اور روشوں پر کھڑے ہو کر علیحدہ علیحدہ اور ایک ساتھ بہت سی تصویریں اتروائیں۔ ایک جگہ بورڈ لگا تھا اس سے آگے تصویر بنانا منع ہے۔ میں نے کیمرا بند کر لیا اور اسے ساتھ لے کر تاج محل کی طرف بڑھا۔ پھر ہم نے وہ پلیٹ فارم دیکھا جو ڈبہ گرنے سے خالص ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ کچھ دیر ہم وہاں کھڑے رہے پھر سیزھیاں چڑھ کر اس چبوترے پر آئے جو عظیم درمیانی گنبد

اور میناروں کی بنیاد کا کام دیتا تھا۔ اور جس کی اس نے پلاسٹر آف پیرس کے ذریعے مرمت کروالی تھی۔

”یہ جالی یہاں سے وہاں تک ٹوٹ گئی تھی۔“ اس نے چبوترے سے نیچے جھانکتے ہوئے کہا۔

”ہاں اور یہ حصہ تو بالکل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔“ میں نے چبوترے کو قدموں سے ٹاپتے ہوئے کہا۔

”یہ وہ مینار ہے جس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔“ وہ بولی۔

”اور اس مینار کے تین ٹکڑے ہو گئے تھے اور مرمت کے بعد بھی وہ ٹیڑھا نظر آتا تھا۔“

”ہاں“ اس نے اتفاق کیا۔

میراجی چاہ رہا تھا جالیوں، دیواروں اور میناروں کو چھو کر دیکھوں مگر ڈر لگتا چھونے سے کوئی ٹکڑا الگ ہو کر نہ گر پڑے۔

ایک روز اس کی چھوٹی بہن کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔ اس کی گرد جھاڑنے لگی تو اس کے ٹکڑے الگ ہو گئے۔ اور پھر ان کو جوڑا

نہ جاسکا کافی عرصہ تک وہ ٹوٹا پھوٹا ادھر ادھر رلتا رہا پھر کسی نے اٹھا کر کوڑے کے ڈرم میں ڈال دیا۔

ہم درمیانے گنبد کے اندر اس ہال میں آئے جہاں بادشاہ اور ملکہ کی قبروں کے تعویذ تھے۔ ہم نے فاتحہ خوانی کی۔ تعویذ کی منقش

اور رنگین پتھروں سے بنی جالیوں کو دیکھا۔ گنبد میں دیر تک سنائی دیتی رہنے والی گونج سنی اور باہر آ گئے۔ میں نیچے والی اصلی قبروں

کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی مگر اسے قبروں سے ہمیشہ بڑی دلچسپی رہی ہے کہنے لگی۔

”نیچے چلو۔ ابھی دعا پڑھ کر واپس آ جائیں گے۔“ پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بولی۔ ”اچھا تم یہاں ٹھہرو میں ابھی آتی

ہوں۔“

وہ سیڑھیاں اتر کر چلی گئی۔ میں کچھ دیر اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب اسے گئے کافی دیر ہو گئی تو میں اسے ڈھونڈتا ہوا نیچے آیا وہاں

کافی رش تھا۔ میں نے گھوم پھر کر دیکھا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ میں اسے تلاش کرتا ہوا باہر آ گیا اور ہر جگہ اسے ڈھونڈا مگر اس کا کچھ

پتہ نہ چلا۔ تھک کر میں دیوڑھی کی ان سیڑھیوں پر آ بیٹھا جہاں سے ہر آنے جانے والا گزرتا ہے۔ خوبصورت عورتیں نئے بیاہتا

جوڑے اور جواں سال لڑکے اور لڑکیاں آ جا رہے تھے۔ مگر اس کا دور دور تک نشان نہ تھا۔

مجھے اس روز دلی پہنچنا تھا۔ اگلے روز میری واپسی کی سیٹ کنفرم ہو چکی تھی۔ میں بوجھل دل کے ساتھ اکیلا ہی لوٹ آیا۔

لاہور آ کر قلم دھلوائی۔ بڑی اچھی تصویریں آئی تھیں۔ مگر وہ تصویروں میں بھی غائب تھی۔



چراغ

جن جگہوں سے کوئی جذباتی یا روحانی تعلق ہو وہ خواہ بہت معمولی ہوں کتنی اچھی لگتی ہیں۔ جونہی فلائنگ کوچ کھلے میدانے علاقے میں داخل ہوئی میں سنبھل کر بیٹھ گیا جیسے ابھی کسی جاننے والے سے ملاقات ہونے والی ہو۔ اونچے اونچے درخت، تالاب، ٹیلے اور دور تک پھیلے کھیت سب میرے جانے پہچانے تھے۔

میں منہ اندھیرے سوار ہوا تھا پچھلے دواڑھائی گھنٹوں میں راستے میں کتنے ہی چھوٹے بڑے گاؤں اور قصبے آئے تھے اور فلائنگ کوچ کتنے ہی خوبصورت اور پر فضا مقامات سے گزری تھی مگر میں بلب کی مدھم روشنی میں صبح کا ہر آن پھیلتا اجالا شامل کر کے نئے مقدمے کی مثل پڑھتا اور نئے نئے قانونی نکتے سوچتا رہا۔ یہ مقدمہ میرے لئے بے حد اہم تھا اور ایک طرح سے چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ بااثر لوگ تھے لیکن کسی نے حامی نہیں بھری تھی کہ وہ ان کے آدمی کو تختے سے اتار لائے گا مجھے بھی اس مقدمے کی پیروی کے لئے کئی روز تک اپنے آپ سے جھگڑا کرنا پڑا تھا۔ فلائنگ کوچ میرے ننھیالی گاؤں کی جوہ میں داخل ہوئی تو میرے اندر یادوں کا خراس چلنے لگا۔ کچی سڑک سے چند فرلانگ ہٹ کر یہ ایک عام سا گاؤں تھا۔ گاؤں تک سرخ اینٹوں کا سولنگ لگا ہوا تھا جس کے دونوں اطراف ہری بھری فصلیں اور سرسبز پہاڑ تھے۔ کچی کچی رت کی صبح ابھی ابھی طلوع ہوئی اور چوباروں اور میناروں سے اتری تھی۔ فلائنگ کوچ کے بندشیشوں سے مہیاں، منڈیریں، زینے اور کابکس سب کچھ صاف دکھائی دیتا تھا۔ آدمیوں، مویشیوں اور پرندوں کی ملی جلی آوازوں کا شور صرف مجھے سنائی دے رہا تھا۔ جگہ جگہ گھروں اور آویوں سے دھوئیں کے گرد باد اٹھ رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ابھی کوئی مجھے پکارے گا اور میرے اس طرح پاس سے گزر جانے کا شکوہ کرے گا مگر وہاں مجھے پکارنے والا کون تھا؟ میرے ننھیال والوں میں سے اب کوئی وہاں نہ رہتا تھا۔ پھر بھی میرا جی چاہا ان چھتوں کی طرف دیکھتا رہوں اور ان باتوں کو یاد کرتا رہوں جو کبھی چاندنی راتوں میں چھت پر لیٹے یا دھندلی شاموں میں پگڈنڈیوں پر چلتے میرے کان میں پڑتی تھیں۔ اور حالانکہ میری ماموں زاد کے پاس کوئی ڈائری نہ تھی اور نہ ہی وہ لکھ پڑھ سکتی تھی مگر اسے ملنے اور جدا ہونے کی تاریخیں اور دنوں کی گنتی کبھی نہ بھولتی تھی۔ پھر مجھے اپنے بدن سے اس گاؤں کی مٹی کی باس آنے لگی۔ جس کی ہواؤں میں کبھی مجھے جنم دینے والی سانس لیتی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی ہوگی۔ ککلی کلیر دی پگ میرے ویردی۔

اسی لمحے میری نظر ایک بوڑھے پر پڑی وہ گاؤں کی طرف سے گرنا پڑتا چلا آ رہا تھا اور ابھی سڑک سے کافی فاصلے پر تھا مگر اس نے فلائنگ کوچ کو روکنے کے لئے وہیں سے ہاتھ بلانا شروع کر دیا تھا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ فلائنگ کوچ ایسے معمولی سٹاپ پر نہیں رکتی۔ اسے تو اس کے کرایہ کے بارے میں بھی معلوم نہیں ہوگا۔ لیکن میرے ساتھ والی سیٹ برابر خالی چلی آ رہی تھی میں نے ڈرائیور سے سفارش کی کہ وہ اس بوڑھے کو ضرور سوار کر لے۔ کوچ کے رکتے رکتے سٹاپ پیچھے رہ گیا۔ ڈرائیور کو رپورس کر کے کوچ پیچھے لانا پڑی۔ میں نے بڑے میاں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اندر کھینچ لیا اور سہارا دے کر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ بڑے میاں کا دم پھول رہا تھا۔ سانس ٹھکانے آئی تو گفتگو شروع ہو گئی۔ پھر تعارف ہوا وہ میرے ننھیالی گاؤں کا چودھری ہاشم تھا۔ میں نے اپنا نام و پتہ اور تفصیل بتائی تو بابا جی بہت خوش ہوئے کہنے لگے۔

”پتر پتر تو تم اپنے نواسے ہو۔۔۔۔۔ تمہاری مرحومہ ماں اور میری بھالیاں کا آپس میں بڑا پیار تھا۔“

”ہاں امی ان کا اکثر ذکر کیا کرتی تھیں۔“ میں نے کہا ”کیسی ہیں ماسی بھالیاں؟“

”اللہ کا بڑا کرم ہے اس پر۔ بیٹے ہیں بہوئیں ہیں مال ڈنگر ہے، کیاریاں ہیں وانی بنجی میں برکت ہے اللہ کی بڑی مہربانی ہے۔“

میں اسی کے پاس جا رہا ہوں۔“

”میرا سلام کہئے گا۔“

”وعلیکم سلام“ باباجی خود ہی سلام وصول کر کے جواب بھی دے دیا۔ پھر تھوڑی دیر کھانسنے کے بعد کہنے لگے۔۔۔۔۔ ”بیٹے کیا

ہوا اگر تمہارا ماموں گاؤں چھوڑ کر شہر چلا گیا ہے تم کبھی ہمارے پاس آؤ۔۔۔۔۔ تمہارا اپنا گاؤں ہے۔“

”اچھا باباجی۔۔۔۔۔ کبھی وقت نکال کر ضرور آؤں گا۔“

”تم کہیں بچپن ہی میں یہاں آتے ہو گے؟“

”جی ہاں بہت عرصہ ہو گیا۔ بچپن اور طالب علمی کے زمانے میں تو یہاں آ کر کئی کئی روز رہا کرتا تھا۔“

باباجی نے میری بات کے جواب میں پتہ نہیں کیا کہا ”میں سن نہ سکا۔ میرے کانوں میں پچیس برس پہلے میلے میں بجنے والے

ڈھول کی گھمکار بھر گئی تھی۔ کچھ دیر میں جھولوں میں ہلارے لیتا، فالودہ پیتا، برف کے رنگین گولے چاقا اور پتلیوں کا تماشا دیکھتا

پھرا۔ پھر سڑک کے کسی پاٹ ہول کی وجہ دکھا لگا تو کہیں جا کر میلے کا غوغا کم ہوا۔ میں نے یاد دلایا۔

”باباجی آپ کو یاد ہے جب آپ کی بہو کے زیورات چوری ہو گئے تھے اور آپ نے چور کا نام بتانے والے ایک رملی سائیں کو

بلا یا تھا۔“

”ہاں پتر۔۔۔۔۔ اچھی طرح یاد ہے، بہت برس بیت گئے۔“

”میں ان دنوں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور میلہ دیکھنے آیا ہوا تھا۔“

”اچھا تو تم نے وہ سارا تماشا دیکھا تھا۔ چور کا کھوج لگانے کا؟“

”ہاں“ میں نے کہا ”کیا آپ کو وہ لڑکے یاد ہیں جن کو سائیں جی نے بند کمرے میں آکھینے کے سامنے بٹھایا تھا کہ وہ چراغ کے

عکس میں چوری کی ساری واردات دیکھیں اور چور کو پچا نہیں۔“

”نہیں پتر“ صرف اتنا یاد ہے کہ ان میں سے ایک اجنبی سا لڑکا روتا ہوا نکلا تھا۔“

”وہ میں تھا۔“ میں نے بتایا۔

”اچھا تم تھے۔۔۔۔۔ تم ہی ہو گے۔“ باباجی نے میری طرف دیکھ کر کچھ یاد کرنے اور ہنسنے لگے۔ ہنسنے سے انہیں کھانسی آ

گئی۔ جب ذرا فاقہ ہوا تو کہنے لگے ”بچپن میں تم بڑے بزدل تھے اب تو نہیں لگتے ہو۔ بھلا اس میں رونے کی کیا بات تھی؟“

”آپ بھی کمال کرتے ہیں باباجی۔“ میں نے کہا ”آپ کو یاد نہیں کہ میرے ماموں کا مزاج کیسا تھا۔ ان کا مرغ، بٹیر یا بھیڑ و

لڑتے ہوئے ہار جاتا تھا تو وہ اسے ذبح کرنے کے لئے چھری تلاش کرنے لگتے تھے۔ میں تو سگا بھانجا ہو کر ان کی پیٹھ لگوا دی تھی اور

سارے گاؤں کے سامنے انہیں شرمندہ ہونا پڑا تھا۔ انہوں نے بڑے شوق اور مان سے مجھے اندر بھجوا یا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بہت

ہوشیار ہوں کیونکہ میں سکول میں پڑھتا تھا مگر جب مجھے چراغ کی لاٹ میں کچھ بھی دکھائی نہ دیا تو انہیں سخت ندامت ہوئی۔ مجھے یاد

ہے شروع میں مجھے اکیلے کو ہی اندر بھیجا گیا تھا۔ سائیں جی بند دروازے کے باہر کندی کھٹکھٹاتے اور بلند آواز میں پوچھتے۔

”حضرت سلیمان کا تخت آگیا ہے؟“

میں جواب دیتا ”نہیں جی“

”گاؤں دکھائی دے رہا ہے؟“

”کوئی نہیں جی“

آخر انہوں نے دولڑکے اور اندر بھجوا دیئے ان دونوں کو اندر آتے ہی سب کچھ صاف دکھائی دینے لگا۔ حضرت سلیمان کا تخت

جھاڑ و دیتی مہترانی، چھڑکاؤ کرتا بہشتی۔ پھر حضرت سلیمان خود تخت پر آ بیٹھے۔ دربار لگ گیا۔ جن اور پریاں آ حاضر ہوئے۔ میں

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا مگر آئینے میں چراغ کی بتی کے گل کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا۔ ان لڑکوں نے چور کو دیکھا۔ چوری کی واردات دیکھی اور ساتھ بتاتے بتاتے رہے کہ کس طرح چور نے تالہ توڑا اور صندوق میں رکھی زیورات کی پونلی اٹھائی اور کیسے عقبی دیوار پھاند کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ انہوں نے چور کا حلیہ بھی بتایا۔ اب آپ ہی بتائیں باباجی میں روتا نہیں تو اور کیا کرتا۔ ایک تو شرمندگی تھی دوسرے ماموں جان کا خوف۔ وہ بہت ناراض ہوئے تھے گاؤں کے لڑکے مذاق کرتے اور میری ماموں زاد کو تو مجھے چھیڑنے کے لئے ایک دلچسپ موضوع ہاتھ آ گیا تھا۔ آخر میں بھاگ کر اپنے گاؤں چلا گیا۔

باباجی نے جیب میں سے سگریٹ کا پیکیٹ نکالا۔ کئی تیلیاں رگڑیں مگر وہ ہچکولوں اور ایئر کنڈیشنڈ ڈکٹ سے نکلنے والی ہوا کی وجہ سے بجھ جاتیں۔ میں نے ان کی مدد کی۔ سگریٹ کا کش لے کر وہ پھر ہنسنے لگے۔ ساتھ ہی ان کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ ہنسی اور کھانسی رکی تو کہنے لگے۔

”پتروہ دونوں لڑکے جھوٹے تھے۔۔۔۔۔ سچ صرف تم نے بولا تھا۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ زیورات نہیں ملے تھے؟“

”غم ہی کب ہوئے تھے؟“

”کیا؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

کہنے لگے ”میری بہور وٹھ کر میکے چلی گئی تھی اور گھر کے سارے زیورات اور گہنے ساتھ لے گئی تھی۔ اس کی بھانج سے ہمارے ہاں بسے نہیں دیتی تھی اسی نے اٹنی پٹی پڑھا رکھی تھی۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ بہو یا گہنے یا دونوں چیزیں واپس آ جائیں مگر ہمیں کامیابی نہ ہوئی۔ پھر ہم باپ بیٹے نے مشورہ کیا اور ایک رات چپکے سے ان کے گھر میں گھس کر اپنے زیورات واپس لے آئے۔ وہ سمجھتے رہے کہ چوری ہو گئے۔ جب زیورات ہی نہ رہے تو بھائی اور بھابی نے خالی ہاتھ لڑکی کو اپنے گھر میں بٹھا کر کیا کرنا تھا۔ پھر اس کی آنکھیں بھی کھل چکی تھیں وہ لوٹ آئی اور آج تک وہی زیورات پہنتی برتی ہے۔ اللہ کے فضل سے اس سے میرے تین پوتے اور ایک پوتی ہے۔“

”پھر وہ چور کا پتہ لگانے والے سائیں جی کو کیوں بلایا تھا۔“

”وہ تو ایک ڈھونگ تھا پتر“ تاکہ سب کو یقین ہو جائے واقعی زیورات چوری ہو گئے ہیں ورنہ میرے بیٹے کا گھر کیسے آباد ہوتا۔“

”اچھا تو سائیں جی کو پتہ تھا؟“

”خاک پتہ تھا۔“

”کمال ہے۔۔۔۔۔ میں خواہ مخواہ زندگی بھرا حساس کمتری کا شکار اور نادام ہوتا رہا۔“

”مجھے یاد پڑتا ہے۔“ باباجی کہنے لگے ”مجھے اس لڑکے کا میرا مطلب ہے تم پر بڑا ترس آیا تھا مگر میں اصل بات بتا نہیں سکتا تھا۔ ویسے میں اندر سے بہت خوش ہوا تھا کہ لڑکے نے ابھی پڑھی تو چار پانچ جماعتیں ہی ہیں لیکن اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ پترا اگر تم ایک بار اس پترا چالاک رملی سائیں کی باتوں میں آکر جھوٹ بول دیتے کہ تمہیں چراغ کے شعلے میں کوئی چیز نظر آرہی ہے تو پھر کئی جھوٹ تم خود ہی ملاتے چلے جاتے جس طرح دوسرے لڑکوں نے کیا۔ پترا میرا ساری حیاتی کا تجربہ کہتا ہے کہ بولنا سچ ہی چاہیے خواہ کتنا بڑا نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑ جائے۔“

باباجی کی بات سن کر میں اندر سے لرز گیا۔

میں انہیں کیا بتاتا کہ جب میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا مجھے نفع و نقصان کا زیادہ پتہ نہیں تھا۔ اب پڑھ لکھ کر مجھے سارے حساب آتے ہیں اور میں کبھی نقصان نہیں اٹھاتا۔

بڑی نہر کے پل پر پہنچ کر باباجی نے فلائنگ کوچ رکوائی اور سلام دعا کے بعد اتر گئے لیکن مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرے اندر بجھ جانے والے چراغ کو روشن کر گئے ہوں۔



کوکھ پر پاؤں

فجر کی نماز پڑھ کر حاجی سراج الدین مسجد سے واپس آتے ہیں اور سیدھے چھت پر چلے جاتے ہیں۔ پچھلے کئی دنوں سے یہ ان کا معمول ہے وہ چڑیوں، کوؤں اور کبوتروں کو روٹی کے ٹکڑے اور دانہ ڈنکا ڈالنے لگتے ہیں۔

سورج ابھی طلوع نہیں ہوا ہے مگر صبح کی روشنی ہر سو پھیل چکی ہے۔ ٹھنڈی نرم ہوا چل رہی ہے اور سڑکوں پر ٹریفک کا شور سنائی دینے لگا ہے۔ اسی لمحے سبزھیوں پر آہٹ سنائی دیتی ہے وہ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچ، نحیف و نزار آمنہ بیگم گویا قبر سے برآمد ہوتی ہیں اور آہستہ آہستہ چلتی ان کے قریب سے گزرتی ہیں۔ اور چھوٹے بڑے دھلے ہوئے کپڑے منڈیر اور رسی پر لٹکانے لگتی ہیں۔ اندوہ کا ایک کانٹا سا حاجی سراج الدین کے دل میں پیوست ہو گیا۔ ابھی کل کی بات لگتی ہے جب وہ پہلی بار اس گھر میں آئی تھیں تو انہیں اپنا جدی پشتی وسیع و عریض گھر تنگ اور چھوٹا معلوم ہوا تھا جیسے وہ اس میں سامنہ رہی ہوں۔ ان کے بدن کا حسن و جمال چھلکا پڑتا تھا۔ وقت کا عفریت دیکھتے ہی دیکھتے ان کا سارا حسن اور شادابی چاٹ گیا ہے اور وہ دکھ سے سوچتے ہیں اور ہمدردی، خوشامد اور اپنائیت کے ملے جلے لہجے میں کہتے ہیں۔

”آمنہ بیگم ابھی آپ کو احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ کو اوپر نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”کیوں اب میرا کوؤں اور کبوتروں سے بھی پردہ ہے؟“

آمنہ بیگم کے منہ سے اس قسم کے الفاظ سن کر وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ انہیں یقین نہیں آیا کہ یہ آواز آمنہ بیگم کی اپنی ہے یا ان کے اندر کوئی جن بول رہا ہے۔ وہم بھی تو ایک جن ہے چٹ جائے تو آسانی سے چھوڑ کر نہیں جاتا وہ دکھ سے سوچتے ہیں۔ کھنکار کا گلاتر کرتے اور کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں مگر زندگی میں پہلی بار اپنی زوجہ کے سامنے الفاظ ان کے حلق میں انک جاتے ہیں۔ مگر چپ رہنے سے شک اور بدگمانی کا بھوت اور زیادہ مچل سکتا ہے۔ اس خیال سے وہ کچھ کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔

”سمجھنے کی کوشش کرو! آمنہ بیگم۔ خدا کو یہی منظور تھا۔ وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

”میں سمجھ چکی ہوں افسوس مجھے آپ کو سمجھنے میں تیس برس لگ گئے۔“

”تمہارا وہم ہے آمنہ بیگم“

”جو پیدا کرتا وہ روزی بھی دیتا ہے۔“

”اس میں کیا شک ہے وہ خالق ہے وہ رازق ہے۔“

”پھر آپ ان پرندوں کے روزی رسان بننے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟“

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بیگم؟“

”کیا آپ سمجھتے ہیں اس سے کفارہ ادا ہو جائے گا۔“

”لاحول ولا قوۃ.....“

”لوگوں کے ہاں اپنا جی بچے پیدا ہوتے ہیں لنگڑے لو لے اندھے بہرے گونگے اور کسرے۔ کیا کوئی انہیں پھینک دیتا ہے۔“

”معلوم ہوتا ہے آمنہ بیگم عمر کے ساتھ ساتھ آپ کی عقل بھی بوڑھی ہو گئی ہے اور صحت کے ساتھ ساتھ ایمان بھی کمزور پڑ گیا

ہے۔ اب آپ اللہ کی مرضی میں بھی دخل دینے لگی ہیں۔“

”پتہ نہیں اللہ کی کیا مرضی تھی مگر آپ کی مرضی یہی تھی۔“

”اللہ تمہیں ہدایت دے۔“

آمنہ بیگم کوئی جواب نہیں دیتیں۔ لگتا ہے ان کا دل بھرا آیا ہے اور وہ اندر ہی اندر رونے لگی ہیں۔ پھر ان کی طرف دیکھے بغیر آہستہ

آہستہ مریضانہ چال چلتی سیزھیاں اتر جاتی ہیں۔ آمنہ بیگم کے اچانک چپ ہو جانے اور کوئی جواب دیئے بغیر نیچے جانے سے انہیں

ہول سا آنے لگتا ہے۔ اس سے تو بہتر تھا وہ کچھ بھی کہتی رہیں ان کے دل کا غبار تو کم ہو جاتا۔ آخر ماں ہے وہ سوچتے ہیں کچھ وقت تو

لگے گا وقت ہی سب سے بڑا امر ہم ہے۔ بڑے سے بڑا گھاؤ بھر دیتا ہے یہ تو معمولی خراش ہے۔

اچانک اس کی نظری پر لگتی ایک زنانہ قمیض پر پڑتی ہے جس کا کپڑا انہیں جانا پہچانا معلوم ہوتا ہے۔ ذہن پر تھوڑا سا زور دینے

سے انہیں یاد آ جاتا ہے کہ یہ صدیقہ کی قمیض ہے اس کا کپڑا انہوں نے خود پسند کیا اور خرید لیا تھا مگر اب قمیض کو دیکھ کر انہیں جھرجھری سی آ

جاتی ہے اتنی بڑی قمیض۔۔۔۔۔؟

کئی مہینوں سے انہیں فاطمہ کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ انہوں نے دل ہی دل میں رشتے برادری کے کئی گھروں کی تلاشی لے ڈالی

ہے مگر کہیں سے اب تک گوہر مقصود ہاتھ نہیں آیا۔ اور نہ ہی کوئی راہ بھانکی دیتی ہے کہ وہ کیسے اور کیونکر اس کے فرض سے سبکدوش ہوں

گے۔ اور اب صدیقہ بھی؟

انہیں یاد آتا ہے جب بڑی کے فرض ادا کرنے کا وقت آیا تھا۔ ابا جان خدا انہیں غریقِ رحمت کرے حیات تھے۔ انہوں نے تنگدستی کے باوجود کچھ نہ کچھ پس انداز کیا ہوا تھا۔ اچھی بھلی کمک مل گئی تھی۔ پھر دوسری کا وقت آیا تو قرعہ اندازی میں ان کے نام پلاٹ نکل آیا تھا اور نہایت عمدہ طریقے سے اس کی رخصتی ہو گئی تھی۔ تیسری کے بارے میں وہ بہت پریشان تھے کوئی صورت نظر نہ آتی تھی لیکن پھر اللہ مسبب الاسباب نے غیب سے ایسی صورت پیدا کر دی کہ وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کمیٹی کے ممبر شیخ یعقوب نے انہیں اپنے مرحوم والد کے حج بدل پر بھجوا دیا۔ جانے سے پہلے انہوں نے اپنے فرض کی ادائیگی کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا۔

”قبلہ آپ بے فکر ہو جائیں واپسی پر اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔“

اور واقعی انہوں نے جو کہا تھا کر دکھایا اور سب کچھ نہایت ہی عمدہ طریقے اور رازداری کے ساتھ ہو گیا تھا اللہ ان کو اس کی جزا دے۔

اگرچہ ان کا ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ اب بھی کوئی بہتر صورت پیدا کر دے گا مگر پھر بھی چوتھی اور پانچویں اور اس کے بعد چھٹی اور ساتویں کا خیال کر کے انہیں ٹھنڈے پسینے آنے لگتے تھے۔ ادھر تیسری کے ہاں زچگی ہوئی تھی بڑی کا سسرفوت ہو گیا تھا اور اس کے چھوٹے کو یرقان نے ہلکان کر رکھا تھا۔ دوسری کی پریشانی ان دونوں سے بھی بڑی وہ تین ماہ سے میکے میں بیٹھی تھی کوئی اسے لینے نہ آتا تھا نہ مفاہمت کی کوئی صورت نظر آتی تھی الناطق کی دھمکیاں بھجوا رہے تھے۔ خیال تھا کہ بڑے بیٹے کو نوکری مل جائے گی تو ہاتھ بنانے لگے گا مگر اس بد بخت کو ٹائپ نہیں آتی تھی اور وہ جس کسی سے بھی سفارش کرتے تھے وہ اتنی تعلیم کے ساتھ ٹائپ کو ضروری قرار دیتا تھا۔ مگر وہ کئی مہینوں سے لوہا کوٹنے کے باوجود ابھی تک اناڑی کا اناڑی تھا۔ چھوٹے دونوں ویسے ہی نچلے درجوں میں زیر تعلیم تھے۔ خود وہ ابھی تک جونیئر ٹیچر تھے اور تنخواہ اتنی قلیل اور مہنگائی اس قدر زیادہ تھی کہ نہایت مشکل سے گزارہ ہو رہا تھا۔ ادھر آمنہ بیگم تھیں کہ پتہ نہیں کس زرخیز مٹی سے ان کا خمیر اٹھا تھا کہ سال چھ ماہ میں ایک آدھ بارش بھی ہو جاتی تو ایک نئی فصل لہلہا اٹھتی۔ کئی بار ان کے ذہن میں شیطان مردود نے خلل ڈالنے کی کوشش کی اور ورغلا یا کہ بھی غیر شرعی احتیاطی تدابیر اختیار کریں مگر وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بدعت سامراج نے اسلام دشمنی اور مسلم کشی کی نیت سے رائج کی تھی اور اس نے سارے پاک معاشرے کو پلید کر کے رکھ دیا تھا۔ اس لئے ہر بار انہوں نے لاحول پڑھ کر اس مکروہ خیال سے چھٹکارا حاصل کیا تھا۔ ان کا ایمان تھا کہ خدا کے حکم کے بغیر ایک پتہ حرکت نہیں کر سکتا تھا اور اس کے کاموں میں رخنہ ڈالنے والوں کے لئے عاقبت میں عذاب الیم تھا۔

اگرچہ سات بیٹیوں کا بوجھ انہیں چودہ طبق جیسا لگتا تھا۔ مگر انہیں پشیمانی تھی نہ وہ ان سے نفرت کرتے تھے۔ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی

امانت اور نعمت جانتے اور شکر ادا کرتے۔ وہ ظہور اسلام سے پہلے کے جاہل عربوں کو جو اپنی بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے تھے۔ بد قسمت گردانتے اور ان کو یاد کر کے تاسف کا اظہار کرتے اس کے باوجود جب چھٹی اور پھر ساتویں بیٹی پیدا ہوئی تھی تو کئی روز تک ان کے منہ ذائقہ خراب رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کر لیا تھا وہ اسے ایک بڑی ذمہ داری اور آزمائش تصور کرتے تھے اور آٹھویں تو بن بلائے مہمان کی طرح وارد ہو گئی تھی۔ مگر شاید اللہ تعالیٰ اب ان کو مزید کسی آزمائش اور مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا وہ پیدائش کے تیسرے روز ہی بیمار پڑ گئی۔ آمنہ بیگم کا اصرار تھا کہ اس کا مناسب علاج کرایا جائے مگر انہیں یقین ہو گیا تھا کہ خدا ان کی ذمہ داریوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا اس لئے علاج معالجے سے کچھ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ انہوں نے آمنہ بیگم کو بھی بار بار سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ اللہ کا مال ہے۔ وہ جب چاہے اپنی امانت واپس لے سکتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس بات میں کیا حکمت اور کیا بہتری ہے۔ مگر آمنہ بیگم اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں حکیموں اور ڈاکٹروں پر تکیہ کرنے لگی تھیں۔

وہ اس روز ظہر کی نماز کے لئے گھر سے نکل رہے تھے جب آمنہ بیگم نے کہا تھا۔ ”آج چوتھا روز ہے کوئی چیز اس کے معدے میں نہیں ٹھہرتی۔ فوراً الٹی کر دیتی ہے اس اللہ کے جی پر رحم کریں اور کسی حکیم یا ڈاکٹر کو دکھا دیں۔“

”اللہ پر بھروسہ رکھو۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”اگر اسے منظور ہے تو وہ ضرور ٹھیک ہو جائے گی اور اگر اسے منظور نہیں ہے تو شہر کے سارے ڈاکٹر حکیم اور ویدل کر بھی اس کی ایک سانس نہیں بڑھا سکتے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے“ آمنہ بیگم نے کہا تھا ”مگر کوشش کرنا تو انسان کا فرض ہے مجھ سے اس کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔“

”فکر نہ کرو۔۔۔۔۔ بس دعا کرو اللہ اس کو تکلیف سے جلد نجات دے۔“

”حاجی صاحب۔۔۔۔۔ آپ نے تو ابھی تک اس بیچاری کو دیکھا بھی نہیں ہے نہ ہی اس کا کوئی نام رکھا ہے۔“ آمنہ بیگم نے

گلوگیر آواز میں کہا تھا۔ ”میں اسے کس نام سے یاد کر کے رویا کروں گی۔“

انہیں آمنہ بیگم پر ترس بھی آیا تھا اور غصہ بھی۔

”اسے کچھ نہیں ہوگا پہلے کبھی کسی کو کچھ ہوا ہے؟“

”اگر آپ اجازت دیں تو میں خود اسے کسی حکیم یا ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔“

”آپ۔۔۔۔۔ آمنہ بیگم آپ خود؟“ انہیں حیرت ہوئی تھی۔

”ہاں میں چھوٹے کو ساتھ لے جاؤں گی آپ کچھ پیسے دے دیجئے۔“

”آپ عمر بھر کے کئے کرائے پر پانی پھیرنا چاہتی ہیں بیگم۔۔۔۔۔ انہوں نے غصے اور رنج سے کہا تھا۔“ اب آپ بازاروں میں جائیں گی غیر مردوں سے ہمکلام ہوں گی؟“

”لیڈی ڈاکٹر بھی تو ہیں بہت سی؟“

”سب بے پردہ ہوتی ہیں“

”اچھا آپ پیسے نہ دیجئے اجازت دے دیجئے میں ہسپتال چلی جاؤں گی۔“

”اوہو آمنہ بیگم آپ کو کیا ہو گیا ہے کیا آپ سمجھتی ہیں کہ نعوذ باللہ زندگی اور موت ڈاکٹروں کے ہاتھ میں ہے؟“

”دل کو تسلی تو ہو جاتی ہے۔“

”اس کے لئے نماز کے بعد دعا کیجئے۔“

یہ کہہ کر وہ ظہر کی نماز کے لئے چلے گئے تھے۔ ان کا ارادہ تھا نماز پڑھ کر جلد واپس آ جائیں گے مگر دھوپ تیز ہو گئی تھی وہ وہیں مسجد کے ایک حجرے میں کچھ دیر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے تھے۔ جب ان کی آنکھ کھلی عصر کی اذان ہو رہی تھی۔

انہیں یاد آ رہا ہے کہ عصر کی نماز پڑھتے ہوئے بھی ان کا دھیان گھر کی طرف لگا رہا تھا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے آمنہ بیگم کے ایمان کی مضبوطی اور صدمے کی صورت میں انہیں صبر جمیل عطا فرمانے کی دعا بھی کی تھی۔ عصر اور مغرب کی نمازوں کے وقفے میں گھر جانا چاہتے تھے مگر انہیں راستے میں شیخ یعقوب مل گئے اور وہ ان کے ساتھ ان کی بیٹھک میں چلے گئے وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ حالات حاضرہ اور علمی مسائل اور موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ وہیں سے وہ مغرب کی نماز کے لئے دوبارہ مسجد چلے گئے تھے مگر ابھی انہوں نے نفل ادا کرنا تھا کہ انہیں اپنا منجھلا بیٹا اسقاوؤں کے قریب کھڑا نظر آیا۔ وہ گھبرا کا اٹھے اور پوچھا ”خیریت تو ہے؟“

”نفی کی حالت خراب ہے اسے بخار بھی ہو گیا ہے۔“ لڑکے نے کہا ”ماں جی کہہ رہی ہیں جلدی گھر آ جائیں یا دوائی بھیج دیں۔“

”آپا سے کہو سورۃ یسین پڑھتی رہیں میں جلد آؤں گا۔“

لڑکا چلا گیا تو انہوں نے واپس آ کر بقایا نماز ادا کی۔ پھر سیدھے حکیم عبدالرحمن کے مطلب پر پہنچے۔ مگر وہاں بہت بھیڑ تھی۔ حکیم صاحب بہت مصروف تھے انہیں اس بھیڑ میں بچی کی علالت اور کیفیت جاننے میں مشکل پیش آ سکتی تھی۔ انہوں نے سوچا کیوں نہ وہ ان کے فارغ ہونے تک آڑھتیوں کے ہاں سے فارغ ہوا کیں۔

پچھلے چند ماہ سے وہ آڑھتیوں کے ہاں ٹیوشن پڑھانے جا رہے تھے۔ عام طور پر جلد ہی فارغ ہو جاتے تھے مگر آج ان لوگوں

کے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے اور ضیافت کا اہتمام تھا اصرار کر کے انہیں بھی روک لیا گیا۔ اور جب وہ فارغ ہو کر حکیم صاحب کے مطب پر پہنچے وہ دکان بند کر کے جا چکے تھے خالی ہاتھ گھر جانا انہیں مناسب معلوم نہ ہوا۔ ویسے بھی عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ سیدھے مسجد میں چلے گئے تاکہ نماز پڑھ کر یکسوئی کے ساتھ گھر روانہ ہوں مگر آج جمعرات تھی اور مسجد میں نماز عشاء کے بعد درس ہوتا تھا۔ خدا اور رسول کے ذکر کو چھوڑ کر جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا اور پھر دعا میں شامل ہونا نہایت ضروری تھا۔

انہیں یاد ہے کہ جب بہت سی دعاؤں کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب نے بیماروں کی شفا کے لئے دعا مانگی تھی تو انہوں نے نہایت خلوص دل سے آمین کہا تھا۔ لیکن ان عورتوں کی عقل ناقص ہوتی ہے آمنہ بیگم کو کون سمجھائے کہ اگر ان کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو وہ آمین کیوں کہتے۔ افسوس ایمان کی کمزوری کی وجہ سے آمنہ بیگم کی سمجھ میں اتنی سی بات نہ آ رہی تھی کہ اللہ کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔

انہیں یاد ہے کہ جب وہ درس اور دعا سے فارغ ہوئے تھے تو سیدھے گھر آئے تھے۔ یہ درست ہے کہ جب انہیں پتہ چلا تھا کہ اللہ نے اپنی امانت واپس لے لی ہے تو انہوں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا تھا مگر اس کی وجہ وہ نہیں ہے جو آمنہ بیگم سمجھتی ہیں بلکہ یہ تھی کہ ایک معصوم علالت اور جان کنی کے عذاب سے نجات پا گئی تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ آمنہ بیگم کی طرح چیخ چلا کر اپنے دکھ کو اظہار نہیں کر سکتے تھے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں رنج نہیں تھا آخر وہ بات تھی۔ مگر آمنہ بیگم کا وہم کیسے دور ہو۔

”اباجی ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ میزبھوں کے درمیان کھڑی ہو کر ہاجرہ انہیں آواز دیتی ہے۔

وہ چونکتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ سورج نکل آیا ہے اور سارے پنچھی دانہ دنگا چگ کر اڑ گئے ہیں۔

”آ رہا ہوں بیٹی“ وہ جواب دیتے ہیں مگر انہیں اپنی آواز بدلی بدلی اور عجیب عجیب سے لگتی ہے جیسے ان کے اپنے اندر بھی کوئی جن ہو۔ وہ زینے کی طرف بڑھتے ہیں۔ اسی لمحے نیچے سے آمنہ بیگم کی سسکی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اور جیسے انہوں نے سیزھی پر نہیں آمنہ بیگم کی کوکھ پر پاؤں رکھ دیا ہو وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔



جہنم سے فرار

نوعمر شدہ محل نما کوٹھی کا یہ ایک کشادہ مگر سامان سے تقریباً خالی کمرہ ہے۔ کونے میں ایک میز ہے جس پر نو بیاہتا جوڑے کی تصویر کا فریم رکھا ہوا ہے۔ دوسرے کونے میں ایک پلنگ ہے جس پر معمولی سا بستر بچھا ہے۔ موزیک کے چمکدار اور پھسلوان فرش پر احتیاط سے چلنا پڑتا ہے۔ دروازوں سے سنتھیک انیمل کی اور دیواروں سے ایمیشن پینٹ کی باس آرہی ہے۔ اسی میز پر جس پر تصویر رکھی ہے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے رات کا نہایت پر تکلف کھانا کھایا ہے۔ ضرورت کی ہر چیز کمرے میں لگے ایک بٹن کو دبا کروہاں منگائی جاسکتی ہے لیکن کسی آشنا چہرے نے دوبارہ اندر جھانک کر نہیں دیکھا۔

ہوا بند ہے اور جس سے دم گھٹا جاتا ہے مگر وہ دونوں خوبصورت اوئی لباس زیب تن کئے کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہیں اور ہر دیکھنے والے پر ہنستے اور پھبتیاں کتے ہیں۔

کھڑکی بند ہے لیکن پردے کا کچھ حصہ ہٹا ہوا ہے جس سے بالکونی پر رکھے گیلے کا ساکت پودا نظر آتا ہے۔ پودا اصلی اور خوبصورت ہے مگر اس پر پلاسٹک کا بنا ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ اس جس زدہ پر تکلف اور اجنبی ماحول میں میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ میں رہ رہ کر سوچتا ہوں کہ میں کہاں آ گیا ہوں کیوں آ گیا ہوں۔ اس سے کہیں اچھا تھا میں کسی ہوٹل یا مسافر خانے میں رات بسر کر لیتا۔ کسی پارک کے بیچ یا فٹ پاتھ لیٹ جاتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟

اٹھ کر گلی میں جھانکتا ہوں۔ کھڑکی کھول کر باہر نکلنے یا فرار ہونے کا راستہ تلاش کرتا ہوں مگر فرار کی کوئی راہ سمجھائی نہیں دیتی۔ کھڑکی کے باہر نہایت مضبوط گرل لگی ہے اور بالکونی سے آگے خلا ہے۔ نیچے کی منزل سے ریڈیو پر طرب یہ گیتوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں تھک ہار کر بستر پر لیٹ جاتا ہوں اور بتی بجھا دیتا ہوں۔ بتی بجھنے سے تپش میں قدرے کمی آ جاتی ہے مگر گھٹن اور جس کم نہیں ہوتا۔

نصف شب کے قریب اچانک مجھے ایک چور راستہ دکھائی دیتا ہے میں اندھیرے میں دبے پاؤں چلتا اس ویران سنان اور پر بیچ گلیوں سے گزر کر ایک لمبی چمکیلی اور دور دور تک پھیلی ہوئی سڑک پر آ جاتا ہوں۔ یہ ایک خوبصورت کشادہ اور پختہ سڑک ہے مگر بیچ بیچ میں کہیں ناہموار اور ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے بھی آ جاتے ہیں۔ اس وقت یہ جس علاقے میں گزر رہی ہے وہاں اس کے دونوں جانب ہرے بھرے کھیت ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درختوں کے جھنڈ اور باغات نظر آتے ہیں اور پرندوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ کہیں

کہیں چھوٹی چھوٹی جھیلوں ایسے تالاب ہیں جن میں کنول تیرتے اور جن پر مرغابیاں منڈلا رہی ہیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور بادل کا ٹکڑا سایہ کئے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ سڑک پلوں، پلیوں اور نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی کبھی سیدھی اور کبھی بل کھاتی دکھائی دیتی ہے (پڑھنے والے اپنی اپنی زندگی کی شاہراہ کو بھی دھیان میں رکھیں) چونکہ مخالف سمت سے اب تک کوئی شخص یا سواری آتی دکھائی نہیں دی اس لئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں ٹریفک ایک طرف ہے اور الٹی سمت کو سفر کرنا ممنوع ہے۔ پھر ایک سائن بورڈ سے پتہ چلتا ہے کہ اس پر چلنے کی رفتار یکساں اور متعین ہے اس کا مطلب ہے جو لوگ آگے ہیں وہ آگے ہی رہتے ہیں اور پیچھے والے پیچھے پھر میری نظر کچھ اور سائن بورڈوں پر پڑتی ہے جن پر لکھا ہے۔

”سڑک سے اترنا منع ہے۔“

”پلٹ کر دیکھنے سے پرہیز کریں۔“

”تیز رفتاری ممکن نہیں۔“

مجھے یاد آتا ہے۔ ہم گھر سے ایک ساتھ چلے تھے۔ اور ہمارا ایک ساتھ روانہ ہونے کا ارادہ اور پروگرام تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے وہ کسی وجہ سے پیچھے رہ گئی۔ کیا پتہ وہ پیچھے پیچھے چلی آتی ہو اس خیال کے آتے ہی میں سڑک کے ضابطوں کی خلاف ورزی پر خود کو مجبور پاتا ہوں اور پلٹ کر دیکھنا چاہتا ہوں لیکن جونہی میں مڑ کر دیکھتا ہوں میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ پیچھے کچھ ہے ہی نہیں۔ وہ نہ کوئی اور۔۔۔۔۔ نہ ہی سڑک۔ سڑک عین میرے پاؤں کے نیچے سے شروع ہوتی اور حد نظر تک آگے چلی جاتی ہے۔ پیچھے دھند اور غبار ہے اور میں نے جتنا راستہ اب تک طے کیا ہے وہ مٹ چکا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں ایک قالین پر چلتا آیا ہوں جو میرے گزرنے کے فوراً بعد یا ساتھ ساتھ رول ہوتا جا رہا ہو۔ میں گھبرا جاتا ہوں اور ضابطے کی خلاف ورزی کرنے اور پلٹ کر دیکھنے پر پشیمان ہوتا ہوں۔ پھر مجھے خیال آتا ہے کہ اگر وہ پیچھے نہیں ہے تو ضرور آگے نکل گئی ہوگی۔ لڑکیاں ویسے بھی سبک رفتار ہوتی ہیں۔ خصوصاً آغاز سفر میں۔۔۔۔۔ خوبصورت مناظر اور آزاد فضا دیکھ کر ان کے اندر اڑنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے پھر ان کے پر نکل آتے ہیں اور وہ اڑنے لگتی ہیں (پڑھنے والے یہاں ایک لمحہ کورکیں اور اپنے اپنے بچپن کی ان لڑکیوں کو یاد کریں جو ان کے ساتھ کھیلتی اور گڑیوں کے بیاہر چاتی تھیں لیکن پھر ان کے تعلیم مکمل کرتے کرتے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہوتے وہ کئی بچوں کی مائیں بن گئیں)

میں چلتے چلتے رک جاتا ہوں سوچتا ہوں ایسے سفر کا کیا فائدہ؟ مگر یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ سڑک نہیں رکتی برابر چلتی رہتی ہے

مگر الٹی طرف کو۔ اور اس کا اتنا حصہ مخالف سمت کو میرے پاؤں کے نیچے سے سرک جاتا ہے جتنا حصہ میں چلتے رہنے کی صورت میں طے کر سکتا تھا۔ میں گھبرا جاتا ہوں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں چلنے یا رک جانے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اس سفر سے مضرت نہیں اور یہ بہر حال درپیش ہے۔ میں سڑک کے اسرار جاننے کے لئے پھر سے میل پتھروں اور سائن بورڈوں کو پڑھنے لگتا ہوں۔

سڑک پر ٹریفک کے تمام ضروری سائن بورڈ موجود ہیں جن سے علم ہو سکتا ہے کہ آگے کس طرح کا کم یا نہایت خطرناک موڑ ہے گھاٹی یا نشیب ہے کسی نہر یا دریا کا پل ہے یا کوئی دوسری سڑک یا ریلوے لائن نیچے اوپر یا لیول کراسنگ سے گزر رہی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ میل پتھر کوئی خاص رہنمائی نہیں کرتے۔ ہر دس میل کے بعد پھر پہلا میل شروع ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سڑک بنانے والوں کو دس سے زیادہ گنتی نہ آتی ہو یا وہ اس کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوں کہ مسافت سے منہا ہو جانے والے میلوں اور فاصلوں کا کوئی حساب کہیں درج اور محفوظ رکھا جائے۔ ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ میل پتھروں پر کسی بستی کا نام یا کسی منزل کا نشان بھی تحریر نہیں ہے جس سے اندازہ ہو سکے کہ کہیں کوئی منزل یا پڑاؤ موجود ہے اور کتنی دور ہے۔ ہر آن بدلتے مناظر اور لینڈ سکیپ کی خوبصورتی کے باوجود سڑک کی ایسی پر اسراریت سے ایک خوف ساز مہن پر سوار ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں کہ سڑک کب اور کس موڑ پر ختم ہو جائے۔ کسی جنگل یا صحرا میں گم ہو جائے یا کسی سمندر کے کنارے پہنچ کر اچانک دم توڑ دے۔

چلتے چلتے دوپہر ہو جاتی اور ہوا کا مزاج بدل جاتا ہے۔ اور وہ ہر چیز کو جھلسانے لگتی ہے۔ جگہ جگہ گرد باد دکھائی دینے لگتے ہیں۔ شیشموں کے سائے ان کے تنوں کی طرف سمٹ آتے ہیں۔ چرند پرند آشیانوں اور گھنی جھاڑیوں میں پناہ لے لے رہے۔ میں اپنا سایہ تلاش کرتا ہوں وہ سکر کر نہایت مختصر ہو گیا ہے اور تیز دھوپ سے بچنے کے لئے میری اوٹ میں چھپتا پھرتا ہے۔

مجھے اس کا خیال آتا ہے اگر وہ پیچھے نہیں ہے کہ پیچھے کچھ ہے ہی نہیں تو یقیناً آگے ہی ہوگی۔ سڑک ختم ہو جانے پر جنگل شروع ہونے یا سمندر کا کنارہ آ جانے پر کسی مقام پر حیران پریشان کھڑی میرا انتظار کرتی ہوگی۔ میری نظر کنارے کے درختوں پر پڑتی ہے۔ شیشموں کی جگہ اب اونچے اونچے سفیدے کے درختوں نے لے لی ہے شاید کوئی بستی قریب ہے میں کسی نئی بستی کے تصور سے خوش ہوتا ہوں کہ میری ہمیشہ سے خواہش رہی ہے نئی نئی بستیاں دیکھوں اجنبی دیاروں میں جا کر قسمت آزمائی کروں۔ مجھے تھکن اور سفر کی صعوبت بھول جاتی ہے اور میں نئے ولولے سے آگے بڑھتا ہوں۔

سڑک سچ سچ ایک خوبصورت بستی میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہ بستی میرے لئے اجنبی اور نئی ہے۔ اس میں سڑکوں کا جال بچھا ہے لیکن میری سڑک اپنے کناروں سمیت ان کے درمیان یا اوپر سے تیرتی ہوئی گزرتی چلی جاتی ہے۔ بازاروں میں لوگ چل پھر رہے

ہیں۔ خرید و فروخت اور کام کاج کر رہے ہیں۔ شاید بہت سے اپنے اپنے گھروں میں سستا بھی رہے ہوں گے۔ ایک جگہ لوگوں کا جھوم دیکھ کر میں چونکتا ہوں قریب جا کر پتہ چلتا ہے ایک خوبصورت پتلی کو نیلام کیا جا رہا ہے قد آدم پتلی کسی عورت کی ڈمی معلوم ہوتی ہے جسے زرق برق لباس اور قیمتی زیورات سے سجایا گیا ہے میں اس پر ایک نظر ڈالتا ہوں میں نے اتنی حسین عورت کا کبھی تصور نہیں کیا (پڑھنے والے مرد حضرات اپنی اپنی محبوبہ اور خواتین اپنی اصلی یا فرضی سوت کا تصور کریں) میں اس پر دوسری بار نظر ڈالنا چاہتا ہوں لیکن سڑک نہیں رکتی اور میں آگے نکل جاتا ہوں۔

دیکھتے ہی دیکھتے سڑک بستی سے بہت آگے نکل آتی ہے۔ بازار سڑکیں لوگ عمارتیں اور نیلام ہوتی پتلی عورت سب کچھ پیچھے رہ جاتا ہے معدوم ہو جاتا ہے پیچھے رہ جانے والی چیزیں کہاں چلی جاتی ہیں۔ یہ سوال مجھے دیر اور دور تک پریشان کرتا رہتا ہے۔ اچانک سڑک کے عین وسط میں ایک بڑا سائن بورڈ ابھرتا ہے۔

سڑک یہاں ختم ہوتی ہے۔

میں رک جانا چاہتا ہوں مگر سڑک نہیں رکتی اور میں سائن بورڈ سے ٹکرا جاتا ہوں۔

کچھ دیر تک مجھے کچھ دکھائی اور بھائی نہیں دیتا البتہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے رہتے ہیں جیسے جنت کہیں قریب ہو۔ میں اہلے فواروں، بہتی نہروں اور پھلوں سے لدے اشجار کا تصور کرنا چاہتا ہوں مگر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

کیا دیکھتا ہوں کہ وہی کمرہ ہے وہی دیواروں اور دروازوں کے رنگ و روغن کی بو۔۔۔۔۔ وہی ادھ کھلی کھڑکی اور اس کے سامنے رکھا ہوا گلاس میں سچ مچ کا پودا ساکت ہے اور پلاسٹک کا بنا ہوا لگتا ہے مگر کمرے کی حالت تبدیل ہو چکی ہے۔ اس میں بیش قیمت قالین بچھا ہوا ہے۔ میز پر رنگ دار گلہ ان میں تازہ پھول سجے ہیں دیوار پر ایک بڑے سائز کی پینٹنگ لگی ہے۔ کارنس پر آرائش کی بہت سی چیزیں سجی ہیں اور کمرہ خوبصورت اور نفیس چیزوں سے اٹا پڑا ہے۔ ایک کونے میں روم کولر چل رہا ہے جس کی ٹھنڈی ہوا سے کمرے میں خشکی بھری ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں رات بھر واقعی کمرے سے باہر رہا ہوں اور میری عدم موجودگی میں بندھا ہوا سامان کھول کر نو تعمیر شدہ کوٹھی کا یہ کمرہ سجایا گیا ہے تو کیا میں سچ مچ رات بھر باہر رہا یا اس قدر گہری نیند سو یا؟۔۔۔۔۔ میں ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا کہ ایک غیر مانوس سی آواز سنائی دیتی ہے۔

”ناشتہ تیار ہے۔“

میں دروازے کی طرف دیکھتا ہوں پتلی عورت سے ملتا جلتا ایک چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ روم کولر کی ہوا کا مزاج اچانک بدل جاتا

ہے اور وہ لوکی طرح جھلسا نے لگتی ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کمرہ تپش اور جس سے بھر جاتا ہے۔ میں جلدی جلدی تیار ہو کر ناشتہ کرتا اور سامان اٹھا کر سڑک پر آ جاتا ہوں۔ تازہ ہوا اور آزاد فضا میں اطمینان بھری لمبی سانس لیتا ہوں اور کسی سواری کا انتظار کئے بغیر پتلی چہروں اور پلاسٹک نما پودے سے دور ہوتا جاتا ہوں۔



اندر کا گھاؤ

فلاننگ کوچ شہر کی حدود سے نکلی تو یوں لگا جیسے سچ مچ اڑنے لگی ہو۔ میں نے پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ سہ پہر کی دھوپ چاروں طرف بجھی ہوئی تھی۔ قریب کے درخت پیچھے کو اور دور کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ کھیت، کھجے، ٹیلوں پر چرتے مویشی اور سفید بادلوں کے ٹکڑے ہر چیز دوڑ رہی تھی۔ میں باہر کے منظر میں اور بھی زیادہ ڈوب جاتا مگر اگلی سیٹ سے ادھیڑ عمر کا ایک آدمی اٹھ کر میرے ساتھ والی خالی سیٹ پر آ بیٹھا اور بولا۔

”آپ کو راولپنڈی جانا ہے؟“

”جی“

”آپ کا نام جاوید ہے؟“

”ہاں“

”مجھے پہچانا؟“

میں نے اسے پہچاننے کے لئے اس کی طرف دیکھا مگر بہت قریب ہونے کی وجہ سے پہچان نہ سکا۔ پہچاننے کے لئے بھی تھوڑا سا فاصلہ ضروری ہوتا ہے۔ چیز یا آدمی بہت زیادہ دور یا بہت قریب ہو تو پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ میں نے کہا۔

”لگتا ہے آپ کو کہیں دیکھا ہے مگر یاد نہیں آ رہا۔“

”ٹھیک ہے باؤ۔۔۔۔۔“ اس نے کہا۔ ”غریبوں کو کون یاد رکھتا ہے!“

اس کے بے تکلف لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی پرانا جاننے والا ہے۔ میں نے اپنائیت سے کہا۔ ”چلو تم ہی اپنا نام

بتا دو۔“

”بتا دوں گا۔“ وہ ہنس کر بولا ”کافی لمبا سفر ہے پہلے تمہارا امتحان تو لے لوں۔“

”امتحان لینے کا کچھ فائدہ نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے شاید ہی یاد آئے۔“

”اچھا پہلے یہ بتاؤ۔۔۔۔۔ کتنے بچے ہیں کیا کرتے ہیں تمہاری نوکری ہے؟“

میں نے جلدی جلدی اپنے بارے میں موٹی موٹی باتیں بتا کر جان چھڑانا چاہی اور پوچھا۔ ”چلو اب تو تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔“

”میں تمہارے ساتھ پڑھتا رہا ہوں۔“

”کہاں؟“

”یہ تم خود یاد کرو۔“ وہ ہنس کر بولا۔

میں نے اپنے سکول کالج اور یونیورسٹی کے پچھڑے ہوئے ساتھیوں کو دھیان میں لانا چاہا مگر اتنی بہت سی اور پرانی باتیں تھوڑے سے وقت میں کیسے یاد آئیں۔

وہ بولا۔۔۔۔۔۔ ”لگتا ہے تم کچھ زیادہ ہی دور نکل گئے۔ اتنی اونچی اڑان کی ضرورت نہیں۔ میں نے زیادہ زیادہ نہیں پڑھا تھا۔ میری پڑھائی لکھائی کتابوں کی بجائے زمانے کے دھکوں اور ٹھوکروں سے ہوئی ہے۔“

”تم مجھے اس امتحان میں فیل ہی سمجھو۔“ میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔ بولا ”اچھا ایک نشانی بتاتا ہوں۔“

”بتاؤ۔“

”مجھے سکول میں مار پڑتی تھی۔“

”وہ تو سب کو پڑتی ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ میں غریب گھر کا لڑکا تھا کمزوروں پر زیادہ غصہ آتا ہے ماسٹر کچ مجھ میری ہڈی پسلی ایک کر دیتا تھا۔“

”چلو یہ تو پتہ چلا تم میرے ساتھ سکول میں پڑھتے تھے۔“

”تو اور کیا میں تمہیں بی اے پاس نظر آتا ہوں۔“

میں پینتیس چالیس برس پہلے بڑے گاؤں کے لوئر ماڈل سکول میں پہنچ گیا۔ مجھے یاد آیا جب میں چوتھی میں پڑھتا تھا ایک نوجوان ماسٹر عبدالغفار جو نیا نیا ایس وی کر کے آیا تھا ہمیں بہت مارتا تھا۔ ایک بار اس نے ذیلداروں کے لڑکے ولایت کی بھی خوب پٹائی کی تھی مگر اگلے روز ولایت کے والد نے سکول میں آکر سب کے سامنے اس کی وہ خبر لی تھی کہ اسے زندگی بھر نہیں بھولی ہوگی۔ اس کے بعد اس نے ولایت کو تو کبھی کبھار نہ کہا مگر دوسرے لڑکوں کی خوب ٹھکانی کرتا رہتا۔ خصوصاً خیر و ماچھی عاشو تلی اور اکو موچی کی تو تھپڑ

اور گھونے مار مار کر شکلیں بگاڑ دیتا، مجھے یاد آیا۔ ان میں اکو موچی سب سے زیادہ نالائق اور ڈھیٹ لڑکا تھا۔ ایک روز ماسٹر عبدالغفار نے املا لکھائی بہت سے لڑکوں نے غلطیاں کیں انہوں نے سب کے کان پکڑ وادیے۔ مگر اکو نے کان پکڑنے اور مرغابننے سے صاف انکار کر دیا۔ ایک تو اس کی غلطیاں سب سے زیادہ تھیں پھر وہ تھا بھی کمیں لڑکا۔۔۔۔۔ ماسٹر صاحب نے مکوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی۔ پھر پوچھا۔

”مرغابننے ہو کہ نہیں؟“

”نہیں جی۔“

ماسٹر صاحب کا خون کھول اٹھا انہوں نے دانت پیٹتے اور نہایت بے دردی سے اس کے کان مروڑتے ہوئے کہا۔ ”نہیں جی کا بچہ“

”ماسٹر صاحب آپ خواہ میرے ٹکڑے کر دیں میں مرغابننے بنوں گا۔“

ماسٹر صاحب نے اس کے سچ مچ ٹکڑے کرنے کے لئے ڈنڈا سنبھالا اور اندھا دھندا سے پیٹتے رہے یہاں تک کہ وہ لہو لہان ہو گیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ماسٹر صاحب گھبرا گئے۔ دوسری جماعتوں کے بہت سے لڑکے بھی جمع ہو گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی آ گئے۔ اسے پٹکھا کیا گیا۔ منہ میں پانی ڈالا گیا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سب کی جان میں جان آئی۔ یہ سکول میں اس کا آخری دن تھا۔

”تم اکو تو نہیں ہو۔۔۔۔۔ اکبر موچی؟“

”ہاں جی، وہ ہنس کر بولا ”شکر ہے تمہیں یاد تو آیا“

”کیا کرتے ہو کہاں ہوتے ہو؟“ گاؤں سے تو تم لوگ بہت عرصہ پہلے ہی چلے گئے تھے۔“

”کیا بتاؤں کیا کرتا ہوں“ وہ بولا ”اور کہاں ہوتا ہوں یہ پوچھ کر بھی کیا کرو گے۔“

”اگر کچھ بھی نہیں بتانا تھا تو پھر پہیلیاں بچھوانے اور میرے پاس آ کر بیٹھنے کی تکلیف کیوں کی؟“

”خاندانہ ہو یا“ وہ لگاؤٹ سے بولا ”اتنی مدت بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے۔“

”تم چھپا کیوں رہے ہو؟“

”اصل بات یہ ہے کہ میں کوئی خاص کام نہیں کرتا اور جو کرتا ہوں وہ بتانے والا نہیں ہے۔ تم سناؤ گاؤں کا کیا حال ہے؟“

میں اسے گاؤں کے بارے میں بتاتا رہا۔ جلد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ گاؤں کے بارے میں اس کی معلومات زیادہ پرانی نہیں تھی

اسی طرح کبھی کبھار گاؤں کا کوئی شخص سرسراہ یا سفر کے دوران اسے مل جاتا تھا اور وہ اس سے گاؤں کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتا تھا۔ میری تعلیم، شادی اور ملازمت کے بارے میں بھی اسے تھوڑی بہت واقفیت پہلے سے تھی۔ گاؤں اور اس کے لوگوں کے بارے میں اس کی دلچسپی دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ جن حالات میں ان لوگوں نے گاؤں چھوڑا تھا وہ بڑے ناخوشگوار تھے۔

مجھے یاد آیا۔۔۔۔۔ ایک روز ہم بہت سے لڑکے سہ پہر کے وقت نہر میں نہانے اور کھیلنے میں مصروف تھے کہ کسی راگبیر نے بتایا ڈیرے کے پاس چودھریوں نے ایک آدمی کا منہ کالا کر کے اسے گدھے پر بٹھایا ہوا ہے۔ ہم سب لڑکے جلدی جلدی پکڑے پہن کر اور جوتیاں ہاتھوں میں لے کر بھاگ بھاگ ڈیرے میں تماشہ دیکھنے پہنچے۔ وہاں سچ مچ ایک آدمی گدھے پر سوار تھا۔ اس کے منہ پر کالا اور گلے میں موتیوں کا ہار تھا اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ چاروں طرف لوگ جمع تھے۔ بچے تالیاں پیٹ رہے تھے اور چھتوں پر عورتیں کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھیں میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی مگر پہچان نہ سکا۔ کالا میں سے اس کی سفید سفید آنکھیں دکھائی دیتی تھیں شکل و صورت کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا مگر پھر ڈھول والے نے ڈگامار کر اس کا نام پکارا۔ اور یہ بھی بتایا کہ اس نے نمبردار کے گھر میں کام کرنے والی ایک مسکین لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ سب لوگ تھو تھو کر رہے تھے۔ مجھے یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ وہ اکو کا باپ رحماں موچی تھا۔ اکو سے میری گہری دوستی نہیں تھی مگر اس سے میرا کبھی جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس نے ایک بار بڑے گاؤں کے دولڑکوں سے لڑائی میں میری مدد کی تھی۔ پھر مجھے بچپن ہی سے خود کو دوسروں کی جگہ رکھ کر دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ مجھے لگا جیسے گدھے پر سوار آدمی میرا اپنا باپ ہو۔ ندامت سے مجھے پسینہ آنے لگا۔ پھر نمبردار اور چودھریوں کے منع کرنے کے باوجود لڑکوں نے اسے اینٹوں اور پتھروں سے لہو لہان کر دیا۔ وہ زخم میری روح پر بھی لگا میرا جی چاہتا وہ مجھے اچھی طرح پہچان لے تاکہ بعد میں اکو کو بتا سکے کہ سارے لڑکوں میں صرف ایک میں تھا جس نے اسے پتھر نہیں مارا تھا اور نہ ہی تالی بجائی تھی۔

مجھے اکو کا خیال آ رہا تھا وہ اس وقت وہاں نہیں تھا یہ اچھا ہی تھا اور نہ یہ منظر دیکھ کر پتہ نہیں اس کے دل پر کیا گزرتی۔ پھر جب اگلے روز وہ لوگ اپنا سامان اور مال ڈنگر لے کر خود ہی گاؤں سے ہمیشہ کے لئے چلے گئے تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ اور یہ دکھ دو چند ہو گیا جب کچھ عرصہ بعد یہ افواہ پھیلی کہ رحماں بے قصور تھا۔ نمبردار نے اس سے کسی نافرمانی کا بدلہ لینے کے لئے اس پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ کچھ عرصہ بعد نمبردار کے خرواروں میں آگ لگ گئی اور کافی نقصان پہنچا تو یہی سمجھا گیا کہ یہ کام رحماں موچی ہی کا تھا۔ پھر دو ایک بار ان کے مویشی چوری ہو گئے تو بھی ان کی ذمہ داری رحماں اور اس کے بیٹے پر ڈالی گئی مگر ان لوگوں کا کبھی کوئی سراغ نہ مل

”سکے۔“

اس کی باتیں سن کر مجھے تھانوں، حوالا توں میں پولیس کے ہاتھوں مر جانے والے ملزموں کی اخباری خبریں یاد آئیں اور میں سوچنے لگا کہ یقیناً وہ اکو جیسے لوگ ہوتے ہوں گے جن کو زیر کرنے کی کوشش میں پولیس انہیں ہلاک کر بیٹھتی ہوگی۔ ایسے لوگ ٹوٹ جاتے ہیں مگر جھکتے نہیں ہوں گے۔

”کسی بڑے مقدمے میں الجھے رہے ہو؟“

”کوئی ایک مقدمہ۔۔۔۔۔۔“ وہ بولا ”چھوٹے بڑے کئی بھگت چکا ہوں۔ اب بھی ضمانت پر ہوں پھر وہ مجھے مختلف مقدموں کی تفصیلات بتانے لگا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس نے جرائم کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ اور وہ اپنا ٹھکانہ بھی تبدیل کرتا رہتا تھا۔ شام ہو چلی تھی باہر کے سارے منظر پھیکے پڑ گئے تھے۔ میں اس سے اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ اچانک چپ ہو گیا اور پریشان نظر آنے لگا۔ پھر مجھے کہنی مار کر کہنے لگا۔ ”بہت برا ہوا ہے۔“

”کیا ہوا؟“

”اس آدمی کو دیکھ رہے ہو جو اپنی سیٹ چھوڑ کر اگلی سیٹوں کے پاس جا کھڑا ہوا ہے۔“

”ہاں“

”وہ ٹھیک آدمی معلوم نہیں ہوتا۔“

میں نے دیکھا۔ پکی عمر کا ایک آدمی ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹوں کے درمیان کھڑا تھا۔ ابھی میں کچھ سوچ اور سمجھ ہی رہا تھا کہ پیچھے کی سیٹوں سے دو آدمی اور اٹھ کھڑے ہوئے ایک ریوالور دکھا کر بولا۔

”خبردار کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔“

”گاڑی روک اوئے۔“ آگے والے نے ڈرائیور کو پستول دکھا کر کہا۔

گاڑی سڑک کے ایک طرف رک گئی۔ انجن بند ہو گیا۔ لوگ پریشان ہو گئے۔ عورتیں گھبرا گئے بچے رونے لگے۔ درمیان والا مسافروں سے پیسے، گھڑیاں اور قیمتی چیزیں چھیننے لگ گیا دوسرے دونوں ریوالور لئے نگرانی کرنے لگے۔

”تمہاری جیب میں جو کچھ ہے چپکے سے ان کے حوالے کر دو۔“ انہوں نے مجھے مشورہ دیا۔ ساتھ ہی اس نے خود بھی جیب سے ہوا نکال کر اور کلائی سے گھڑی اتار کر ان کے حوالے کر دی۔ میں نے بھی سارے پیسے نکال کر دے دیئے۔ گھڑی بھی اتار دی۔ میری

جیب سے پار کر کا قلم ڈاکو نے خود نکال لیا۔ میں سمجھ گیا کہ اکو بھی ان کے ساتھ ہے اور شاید اس نے میری وجہ سے کھلم کھلا اس کا اعلان کرنے سے گریز کیا ہے۔ پندرہ سولہ سواریوں میں تین چار ڈاکو۔ میں سوچنے لگا کیا پتہ ابھی اور بھی ہوں۔ بھیس بدل کر بیٹھے ہوں مسافر کم اور ڈاکو زیادہ۔ مجھے تو ساتھ والی سیٹ کے بوڑھے سے بھی ڈر لگنے لگا جیسے ابھی وہ بھی اٹھ کھڑا ہوگا اور ڈب سے چاقو نکال لے گا۔

اکو کو میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے دکھ سے سوچا مگر شاید وہ مجھ سے اس سارے گاؤں کا بدلہ لے رہا تھا جہاں سے اسے اور اس کے والدین کو بے عزت کر کے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس نے جیب سے گولڈ لیف کا پیکٹ نکالا اور ڈاکو سے بڑی بے تکلفی سے کہنے لگا۔ ”سگریٹ پی لوں؟“

ڈاکو نے اس کی طرف گھور کر دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ وہ اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے پیکٹ میری طرف بڑھایا اور بولا ”لو سگریٹ پیو اور جو ہوا ہے اسے صبر و شکر سے برداشت کرو۔“

نفرت، غصے اور خوف کے ملے جلے جذبات سے میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ میں نے سگریٹ نہیں لیا۔ میرا جی اس سے بات کرنے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ کوچ میں قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ مسافر سہمے ہوئے تھے۔ کوئی اونچی آواز میں سانس بھی نہیں لے رہا تھا۔ ڈاکوؤں نے ڈرائیور، کنڈیکٹر اور ایک ایک مسافر کی تلاشی لی اور ہر ایک سے روپیہ پیسہ چھین لیا تھا۔ اور اب مسافروں کا سامان، اٹیچی کیس اور عورتوں کے پرس کھول کھول کر دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ انہوں نے اکو سے بھی بنوا اور گھڑی چھین لی تھی مگر وہ بڑے اطمینان سے بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ ساری فلائنگ کوچ میں صرف وہی اکیلا پرسکون تھا بلکہ مسخریاں کر رہا تھا۔

”اس کو کہتے ہیں چوروں کو پڑ گئے موڑ“

لیکن مجھے اس کی کوئی بات اچھی نہیں لگ رہی تھی جی چاہتا بلند آواز میں سب کو بتاؤں کہ یہ اکو موچی ہے۔ یہ میری یا کسی دوسری مصلحت کی وجہ سے خود کو مسافر ظاہر کر رہا ہے مگر اندر سے ڈاکوؤں سے ملا ہوا ہے۔ یہ بچپن ہی سے مجرمانہ اور باغی ذہن کا مالک ہے اس کا باپ بھی ایسا ہی تھا ضرور اس نے مسلمان لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہوگا۔ پنچایت نے ٹھیک ہی اس کا منہ کالا کیا اور جوتیوں کے ہار پہنا کر اس گدھے پر بٹھایا تھا۔ مگر میں منہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ سوچا خواہ مخواہ اسے خفا کرنے اور کھلم کھلا اس کی دشمنی مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ چاقو یا پستول لے کر کھڑا ہو گیا تو میں اس کا کیا کر لوں گا۔ ایسے بد معاش لوگوں کا دین نہ ایمان کسی کی شرم نہ لحاظ۔

لوٹ مار کے بعد ایک ڈاکو دروازہ کھول کر باہر نکل گیا دوسرا پستول ہاتھ میں لے کر دروازے میں کھڑا ہو گیا تیسرا لوٹے ہوئے

سامان سے بھرا تھیلا لے کر باہر جانے لگا تو اس کی نظر دروازے کے قریب والی سیٹ پر بیٹھی نوجوان عورت کی بالیوں پر پڑی۔
”یہ بھی اتار دو۔“ اس نے حکم دیا۔

عورت نے فریادی نظروں سے مسافروں کی طرف دیکھا اور تامل کیا۔

”اتار دو بہن“ اُکو نے مشورہ دیا۔ عورت نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور بالیاں اتارنے لگ گئی۔ اس نے ایک طرف کی اتار کر دے دیں مگر دوسری طرف کی بالیاں اتارنے میں اسے مشکل پیش آرہی تھی۔
”جلدی کرو“ ڈاکو غریبا۔

بے چاری کے ہاتھ کانپ رہے تھے ذرا سی دیر ہو گئی تو ڈاکو نے جھپٹ کر بالیاں اس کے کانوں سے کھینچ لیں۔ اس کا کان پھٹ گیا مارے درد کے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ سارے مسافر دم بخود یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہر شخص اندر ہی اندر کھول رہا تھا مگر کسی کا بس نہیں چل رہا تھا۔

”یہ تم نے کیا کیا ہے بے غیرت آدمی“ اچانک اُکو گر جا اور بالیاں چھین کر دروازے کی طرف لپکتے ڈاکو پر جھپٹ پڑا۔ دروازے میں کھڑے ہوئے ڈاکو نے فائر کر دیا اور جلدی سے نیچے اتر گیا۔ اُکو کو گولی لگ گئی تھی مگر اس نے تھیلے والے ڈاکو کو اپنی گرفت سے نہ نکلنے دیا اور اسے پائیدان سے واپس اندر گھسیٹ لیا۔۔۔۔۔ فائر کی آواز سن کر اور اُکو کی ڈاکو سے کشتی دیکھ کر مٹی کی مورتیں بنے مسافروں میں جیسے جان سی پڑ گئی اور سب نے مل کر تھیلے والے پر قابو پا لیا۔۔۔۔۔ ادھر اچانک ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور بٹن دبا کر کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔

گولی اُکو کے پیٹ میں لگی تھی۔ زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اسے سنبھالا اور کہا۔ ”یہ تم نے کیا کیا اُکو؟“
”میں نے بہت ضبط کیا یا۔۔۔۔۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”مگر اس کم بخت نے بھی میرے اندر کے گھاؤ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔“



”تبدیلی؟۔۔۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے وقت ٹھہر گیا ہے۔ سورج سوانیزے پر آ کر ٹک گیا ہے۔ دوپہر ڈھلنے کا نام نہیں لیتی۔ اور ہم سب آہستہ آہستہ پتھر ہوتے جا رہے ہیں۔“

”ایسا ہرگز نہیں ہے وقت کبھی نہیں رکتا۔ کائنات میں تغیر و تبدل کا عمل ہر لمحے جاری رہتا ہے اور تبدیلی ناگزیر ہے۔“

”محض تبدیلی بے معنی چیز ہے۔ موسم کی تبدیلی سے ٹھنڈے مرنے کی بجائے آدمی آتش فشاں آگ اور لاوے میں بھسم ہو جائے یا پیاس سے مرنے کی بجائے سیلاب میں ڈوب کر ہلاک ہو جائے تو ایسی تبدیلی کا کیا فائدہ؟“

”تبدیلی مثبت بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”جب آپ منفی ہتھکنڈوں کے بیچ بوتے چلے جائیں تو مثبت تبدیلی کیسے آئے گی۔ اس بستی میں مثبت نتائج کے حصول کے لئے ہمیشہ منفی رویے اختیار کئے گئے۔ انسانی خون کو اڑا کر دیا گیا۔ ظلم، دہشت گردی اور تشدد کو رواج دیا گیا۔ خوف و ہراس اور عدم تحفظ کی ایسی فضا قائم کر دی گئی کہ لوگ خود غرض حریص اور کمینے ہوتے چلے گئے۔“

”یہ سب ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کوئی نئی بات نہیں۔ کیا تم بھول گئے کہ اس وقت بھی جب دنیا میں صرف چار پانچ لوگ تھے بھائی بھائی نے بھائی کا خون بہایا۔ میں نے کہیں پڑھا کہ انسانی تاریخ کے چار ہزار برسوں میں مجموعی طور پر صرف 234 برس ایسے ہیں جن میں کسی ملک میں جنگ کا سراغ نہیں ملتا۔“

”ہاں مگر پہلے زمانے کی جنگیں اور طرح کی ہوتی تھیں۔ یہ شہریوں کے خلاف نہیں فوجیوں کے خلاف لڑی جاتی تھیں۔ ان میں کسی حد تک بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ بھی ہوتا تھا۔ اب ایک کمزور ناتواں کمینہ شخص بھی بم یا راکٹ پھینک کر اور کسی مشین کا بٹن دبا کر ان گنت بہادروں کو موت کی نیند سلا سکتا ہے۔“

”کیا تم ان جنگوں کو بھول گئے جن کے سلسلے طویل مدت تک چلے اور وہ جنگیں۔۔۔۔۔ جن میں کھوپڑیوں کے مینار بنائے جاتے تھے۔ بستیوں کو تاراج کر دیا جاتا تھا۔ پکی ہوئی فصلوں اور پھلوں سے لدے اشجار کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ مردوں کو تہ تیغ کر دیا جاتا تھا اور عورتوں اور بچوں کو کنیزیں اور غلام بنالیا جاتا تھا۔ ان کی خرید و فروخت کی منڈیاں لگتی تھیں۔ پھر عالمی جنگیں۔۔۔۔۔“

”میں اس سے پہلے زمانے کی بات کر رہا ہوں جب جنگ بستیوں سے دور کھلے میدانوں میں لڑی جاتی تھی۔ تلوار سے ایک آدمی ایک وقت میں ایک ہی آدمی کو قتل یا زخمی کر سکتا تھا۔ لڑنے والے کے ہاتھ میں تیر کمان یا تلوار ہوتی تھی، بم نہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ اونٹ گھوڑے یا ہاتھی پر سوار ہوتا تھا ٹینک اور طیارے میں نہیں۔“

پڑھنا اور ریڈیو ٹی وی سے خبریں اور حالات حاضرہ کے پروگرام دیکھنا سنا بند کر دو۔“

”اس سے کیا فرق پڑے گا۔ کیا میرے خبریں نہ سننے سے دنیا میں امن قائم ہو جائے گا اور پھر محض خبریں ہی نہیں ہر جگہ ہر وقت ایسے لوگ ملتے ہیں جو تشدد کے مرتکب یا شکار ہو چکے ہوتے ہیں یا ہو رہے ہوتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ تفریح پروگرام اور لٹریچر بھی تشدد کے اظہار و بیان سے خالی نہیں ہے۔ وڈیو کیسٹ کی دکانوں اور اخبارات میں چھپنے والے فلموں کے اشتہار دیکھ کر ہی وحشت ہونے لگتی ہے۔ موت کے سوداگر، کرائے کے قاتل، ہنڈرڈ رائفلز، خوفناک انتقام، ظلم و ابدلہ، آگ ہی آگ، کل اینڈ کل اگین“

اشتہاروں اور پوسٹروں میں جو تصویریں دکھائی جاتی ہیں ان کے ہیروز اور ولنز چھریاں لہراتے، گولیاں چلاتے، غیض و غضب سے جھگھڑاتے اور للکار تے نظر آتے ہیں۔ شاید ہم سب ایک دوسرے سے سخت نفرت کرتے اور انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اسی لئے ہم اور ہمارے بچے ایسی فلمیں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ غالباً ان سے ہمارے ایسے جذبات کی تسکین ہوتی ہے جو اپنے ساتھیوں، مخالفین اور رقیبوں کے لئے ہمارے اندر موجود ہوتے ہیں۔ ہماری سیاست جلتی پرتیل چھڑکتی رہتی ہے۔ ہر آنے والا جانے والے کے احتساب پر کمر بستہ رہتا ہے۔ برسوں تک ہر صبح اخبار کے پہلے صفحے پر نظر آنے والا ”ہر دلعزیز“ لیڈر ایک دن اچانک ”مجرم“ قرار پاتا ہے اور اچانک ساری تصویروں، خبروں اور افواہوں سے خارج ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات اسے برسر عام اور بعض اوقات خفیہ طریقے سے قتل کر دیا جاتا ہے۔ قتل نہ کیا جاسکے تو اس کی زندگی ضرور عذاب بنادی جاتی ہے۔ سیاسی لیڈروں کے بیانات پڑھ کر ہول آتا ہے۔

”منہ کی کھانا پڑے گی۔“

”اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔“

”کیفر کردار کو پہنچایا جائے گا۔“

”احتساب کیا جائے۔“

”سزائے موت دی جائے۔“

مذہبی پیشوا جن کا کام خیر و برکت کی نوید سنانا، امن و آشتی اور محبت کا پیغام پہنچانا ہوتا ہے، مطالبہ کرتے ہیں۔

درے لگائے جائیں

ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔

سولی پر چڑھایا جائے۔

نگسار کیا جائے۔

اخبارات تشدد کی خبروں کو خاص طور پر دلچسپ سرخیوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

ناک کاٹ دی

تیزاب پھینک کر چہرہ بگاڑ دیا

کم سن بچے سے بد فعلی کے بعد گلا گھونٹ دیا

چھری مار آنتیں باہر نکال دیں

جہیز نہ لانے پر زندہ جلا ڈالا

کھانے میں زہر دے دیا

اب تم ہی بتاؤ کیا یہ بستی رہنے کے قابل ہے۔ کم از کم میں تو اب یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔“

”لیکن تم جاؤ گے کہاں؟۔۔۔۔۔ کیا واپس گاؤں جانے کا ارادہ ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں گاؤں سے بھاگ کر تو یہاں آیا تھا۔۔۔۔۔ وہاں آئے روز ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کا محض تصور کر کے روگٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمارا گاؤں بہت خوبصورت ہے جگہ جگہ باغات، پانی کے تالاب اور درختوں کے جھنڈ۔ قریب ہی نہر بہتی ہے جس کے دونوں جانب ہرے بھرے خوبصورت کھیت حد نظر تک پھیلے نظر آتے ہیں۔ لیکن گاؤں کے دو قبیلوں میں پچھلے پچاس ساٹھ برس سے دشمنی چلی آتی ہے۔ ان بدذوقوں نے انتقام در انتقام کے سلسلے میں بے شمار خونریزیاں کی ہیں۔ انہوں نے زمین کا کوئی خوبصورت ٹکڑا ایسا نہیں چھوڑا جو خون آلود نہ ہو۔ سب سے پہلا قتل پانی کی باری پر کھیتوں میں ہوا تھا۔ دوسرا قتل مخالفین نے اناروں والے باغ کے قریب اس وقت کیا جب چاندنی رات میں مقتول اپنے دھان کے بوہل کے قریب سویا ہوا تھا۔ وہ اسے گنڈاسوں، برچھیوں سے چھلنی کر کے بوہل پر سسکتا چھوڑ آئے تھے۔ یقیناً اس کی موت نہایت اذیت ناک تھی۔ اس کے جواب میں مخالفین نے ان کے ایک نوجوان کو نہر کے کنارے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ایک اور لڑکے کو جب وہ سکول سے واپس آ رہا تھا گلی میں پکڑ کر دن دیہاڑے ذبح کر دیا گیا۔ جب وہ اس پر چھری چلا رہے تھے اس کی ماں سامنے چھت پر کھڑی دو ہتروں سے چھاتی پیٹ رہی تھی اور واسطے دے رہی تھی۔ بوڑھا رحمان آم کے باغ میں قتل ہوا وہ پیٹ سے باہر نکلی آنتوں کو سنبھالے خود اپنے پاؤں پر چل کر گھر کی چوکھٹ تک آ گیا مگر چوکھٹ عبور نہ کر سکا۔ علیا کو ایک کمہار لڑکے سے قتل کرایا گیا۔ جس نے ٹوکا مار کر اس کی گردن اڑا دی۔ کہتے ہیں یہ وارا تانا چانک بھر پور اور خلاف توقع تھا کہ بے سر کے جسم نے اچھل کر کھڑے ہونے کی کوشش اور اس کے کٹے

ہوئے سر پر کھلی آنکھیں دیر تک حیرت اور غصے سے قاتل کو گھورتی رہیں۔ علیا کے بھائیوں نے جب کہاروں کے لڑکے کو قتل کیا تو پہلے اس کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے۔ پھر ناک پھر کان۔ اس کے بعد وہ اس بچے کے آدھے آدمی کو گنڈا سے میں پرو کر رات بھر کھیتوں اور کھلیانوں میں لئے پھرے اور اس سے علیا کے قتل پر اکسانے والوں کے نام پوچھتے اور اسے ایذا پہنچا کر انتقام لیتے رہے۔ وہ ان کی منت سماجت کرتا نہیں خدا رسول کا واسطہ دیتا کہ وہ اس کے گلے پر ٹوکا مار کر اسے اس عذاب سے نجات دلائیں مگر وہ اسے زیادہ سے زیادہ دیر تک اذیت دینا چاہتے تھے۔ پھر وہ انہیں فحش گالیاں دینے لگا تا کہ وہ طیش میں آ کر اس کا گلا کاٹ دیں یا سر کچل دیں۔ مگر وہ اس کے جسم میں خنجر کی نوک اتار کر نکال لیتے۔ آخر کار خون بہہ جانے کی وجہ سے اس پر خود غشی طاری ہو گئی اور وہ ختم ہو گیا۔ قاتلوں کی اس پر بھی تشفی نہ ہوئی انہوں نے اس کا قیمہ کیا اور بہتی نہر میں دور تک بکھیر دیا تا کہ اس کا کوئی سراغ نہ مل سکے۔

”یار یہ تو بہت ہولناک واقعات ہیں۔“

”ایسے واقعات دیہات میں اکثر پیش آتے رہتے ہیں اسی لئے میں وہاں سے بھاگ آیا تھا خود میرے ایک چچا نے کسی کا خون کر دیا تھا اور اب اشتہاری ملزم تھے۔ اگر میں تعلیم کے بہانے گاؤں سے بھاگ نہ آتا تو کسی کے خون سے ہاتھ رنگتا یا مجھے کوئی مار ڈالتا؟“

”گاؤں میں وقت کے ساتھ تبدیلی نہیں آئی؟“

”تبدیلی آئی ہے۔ اب وہاں گنڈاسوں اور برچیوں کی جگہ رانٹلوں اور کلاشکوفوں کا استعمال ہوتا ہے۔ دوسری تبدیلی یہ آئی ہے کہ پہلے قاتل گرفتار ہو جاتے یا خود پیش ہو جاتے تھے اب انہیں وزیروں اور سیاسی لیڈروں کی پشت پناہی حاصل ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تم گاؤں نہیں جاؤ گے۔“

”بالکل نہیں۔“

”اور تم نے یہاں نہ رہنے کا بھی اٹل فیصلہ کر لیا ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اس بستی میں میں نے اتنا عرصہ گزارا ہے مجھے یہ بہت اچھی لگتی تھی مگر جو کچھ یہاں ہو رہا ہے وہ سب تمہارے سامنے ہے۔ یہاں قتل و غارت اور سفاکی کا چلن عام ہو گیا ہے۔ یہاں کوڑوں سے کھال ادھیڑی گئی۔ کند آلات سے لوگوں کے سر کچلے گئے۔ دھماکے لاشیں خون اور مجروحین کی چیخ و پکار روزمرہ زندگی کا معمول بن گئے۔ مجھے لگتا ہے کہ دنیا ایک بڑا سلاٹر ہاؤس ہو نہ ہو لیکن ہم سب ضرور ایک بوچڑ خانے میں رہتے ہیں۔ لسانی، سیاسی، علاقائی اور فرقہ وارانہ اختلافات اور فسادات نے بستی کی فضا کو اس قدر مسموم کر دیا ہے کہ سانس لینا دو بھر ہو گیا ہے۔ کسی کی جان اور عزت محفوظ نہیں ہے ہر کسی کے ہاتھ میں خنجر اور بندوق ہے جگہ جگہ اسلحہ خانے

ہیں ویڈیو کیسٹ کی طرح کلاشکوف بھی کرایہ پر مل جاتی ہے۔“

”ہاں سنا ہے بستی میں اکثر ایسی گاڑیاں گھومتی رہتی ہیں جن میں سوار نامعلوم لوگ راگیروں پر اندھا دھند فائرنگ کر کے گزر جاتے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اور میں ایسی موت سے ڈرتا ہوں، پناہ مانگتا ہوں۔“

”اچھا تو کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“

”ایسی جگہ جہاں امن ہو سکون ہو۔ جہاں کوئی کسی سے نفرت نہ کرتا ہو انتقام لینا نہ چاہتا ہو۔“

”ایسی تو کوئی جگہ نہیں سوائے۔۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ تم ٹھیک سمجھے۔“

”کیا یہ بذات خود تشدد اور بدذوقی نہیں ہے؟“

”ٹھہرو یہ بیت ناک گڑ گڑا ہٹ کیسی ہے؟“

”شاید صور پھونکا جا رہا ہے۔ چلو خلاصی ہوئی۔“

”اف اتنا بڑا دھماکہ۔۔۔۔۔ یقیناً بہت بڑا نقصان ہوا ہوگا۔“

”ہاں مسلسل دھماکوں کی آوازیں آرہی ہیں۔“

”پتہ نہیں ان لوگوں پر کیا گزری ہوگی جو ان دھماکوں کے آس پاس تھے۔ پتہ نہیں کتنے لوگوں کی کھوپڑیاں اڑ گئی ہوں گی۔ بوٹیاں ہوا

میں بکھر گئی ہوں اور کتنے ہی لوگ لمبے کے نیچے دبے اور جھلے ہوئے مدد کے لئے پکار رہے ہوں گے۔ چلو چل کر ان کی مدد کریں۔“

”ہاں چلو۔۔۔۔۔ جلدی کرو۔“

”میرا خیال ہے اتنا بڑا دھماکہ پہلے کبھی نہیں ہوا۔“

”ہاں واقعی۔۔۔۔۔ اب تو انتہا ہو گئی ہے۔“

”اگر واقعی یہ انتہا ہے تو پھر تم یقین کر لو کہ تبدیلی ناگزیر ہے۔ یقیناً اب نئے دور کا آغاز دور نہیں ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“



چھوٹے بڑے لوگ

اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ کمرے میں سگریٹوں کا دھواں پھیلا ہوا تھا اور وہ بستر پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا۔

اگرچہ کچھ دنوں سے اس کی اپنی بیوی سے بول چال بند تھی مگر اس کے گھر میں موجود نہ ہونے سے اسے عجیب وحشت سی ہو رہی تھی۔ پچھلے چند روز سے ایک ہی گھر میں رہتے اور ایک ہی بیڈ پر ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے سے دور دور تھے۔ مگر گھر کے سارے کام معمول کے مطابق چل رہے تھے۔ وہ صبح اٹھ کر دفتر کے لئے تیار ہوتا تو وہ میز پر ناشتہ لگا چکی ہوتی۔ وہ چپ چاپ ناشتہ کرتا اور بریف کیس اٹھا لیتا اور باہر نکل جاتا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس سے پہلے جب وہ گاڑی رپورس کرتا تھا وہ دروازے میں کھڑی نظر آتی تھی مگر اب دروازہ بند رہتا تھا البتہ کبھی کبھی اسے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا ہلتا ہوا پردہ دیکھ کر شک پڑتا وہ اس کے پیچھے کھڑی ہے۔ سہ پہر کو دفتر سے لوٹتا تو حسب معمول روزمرہ ضرورت کی چیزیں اور پھل وغیرہ لانا نہ بھولتا۔ وہ آگے بڑھ کر لفافے تھام لیتی اور ٹوکری یا فرنیچر میں رکھ دیتی۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولتی۔ وہ کپڑے بدلنے لگتا تو اتنی دیر میں وہ کھانا گرم کر کے لے آتی۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر پہلے بھی ناشتہ کرتی تھی نہ کھانا کھاتی تھی۔ گاؤں کی اکثر عورتوں کی طرح وہ مردوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کو معیوب سمجھتی تھی چاہے وہ مرد شوہر ہی کیوں نہ ہو۔ کھانا کھا کر وہ اٹھ جاتا تو وہ برتن اٹھا کر کچن میں لے جاتی اور وہیں پیڑھی پر بیٹھ کر اوریوں چھپ کر کھانا کھاتی جیسے کوئی جرم کر رہی ہو۔

اس نے چند ہی مہینوں میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اور اسے شوہر کی عادات، ضروریات اور معمولات کا اچھی طرح علم ہو چکا تھا۔ اسے کسی بھی کام یا بات کے لئے دوبارہ نہیں کہنا پڑتا تھا۔ وہ اچھے گھر کی تھی ناز و نعم میں پلی تھی مگر وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جنہیں اپنا گھر بنانے سجانے کا بہت شوق ہوتا ہے اور جس کی وہ بچپن ہی سے گڑبوں کے بیاہ رچا کر تربیت حاصل کرتی رہتی ہیں۔ اپنی بڑی حویلی اور کنبے کے مقابلے میں دو افراد پر مشتمل کنبے اور سات مرلے کے پلاٹ پر بنے ہوئے گھر کی دیکھ بھال اسے بہت معمولی سی بات لگتی تھی۔ بلکہ شاید اس کے جذبہ شوق کی پوری طرح تشفی بھی نہ ہو پاتی ہو۔

صفائی کا اسے اس قدر خیال رہتا تھا کہ بعض اوقات اسے الجھن ہونے لگتی۔ مجال ہے جو کہیں فرش پر تنکا تک پڑا نظر آ جائے یا صوفے کا گرد پوش میلا دکھائی دے جائے۔ جب کبھی کوئی مہمان اس چھوٹے سے گھر میں آتا اندر داخل ہوتے ہوئے کمرے کی جگ

دھج دیکھ کر جوتے اتار دینے پر مجبور ہو جاتا۔

گھر اس کے لئے سچ ایک عبادت گاہ کی طرح تھا۔ وہ اسکی صفائی، سجاوٹ اور تقدس کا بہت خیال رکھتی۔ لیکن پھر دونوں میں معمولی سی بات پر جھڑپ ہو گئی اور بول چال بند۔ اس جھگڑے کا گھر کی دیکھ بھال یا کام کاج سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گھر کے سارے کام اسی طرح چل رہے تھے۔ وہ شام کو ایک ساتھ بیٹھ کر ٹیلی ویژن دیکھتے، مزاحیہ پروگرام پر ہنس بھی لیتے بس صرف اتنی احتیاط کرنا پڑتی کہ ہفتے وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا نہ جائے اور اپنی ہنسی کو اپنے تک محدود رکھا جائے۔ رات کو وہ ٹیبل لیمپ جلا کر اخبار یا کتابیں پڑھتا رہتا وہ اپنی طرف کا لیمپ جلا کر آنے والے مہمان کے موزے اور سوئیٹر بنتی رہتی۔ اس دوران انہیں اس بات کا خیال رکھنا پڑتا کہ بے دھیانی میں ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کر بیٹھیں۔

وہ پہلی بار ایک دوسرے سے روٹھے تھے اور ان کے درمیان زیادہ ٹکرا نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے دلوں میں غبار رہ گیا تھا۔ اتفاق سے ان چند دنوں میں کوئی مہمان نہیں آیا تھا ورنہ مشکل ہو جاتی یا پھر انہیں ضرورتاً اور مصلحتاً ایک دوسرے سے بات چیت کرنا پڑتی۔

آج شام کو پڑوس میں ماتم ہو گیا۔ پڑوس کی جوان بیٹی زچگی کے دوران فوت ہو گئی تھی۔ اسے رات بھر وہیں رہنا تھا۔ وہ چلی گئی تو اسے احساس ہوا کہ اس کے بغیر گھر کتنا سونا لگتا تھا اور اس میں رہنا کتنا مشکل۔ وہ اسے کھانا دے کر چلی گئی تھی اور پھر اس نے کسی بچے کے ہاتھ کہلا بھیجا تھا کہ وہ رات کو نہیں لوٹ سکے گی۔ اس نے دروازے کی کنڈی نہیں لگائی تھی تاکہ اگر وہ رات کے کسی پہر گھر آنا چاہے تو اسے دقت نہ ہو مگر اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے گھر سے گئے طویل عرصہ گزر گیا ہو۔ کانس پر رکھی اس کی تصویر دیکھ کر اس کا جی اور بھی بے چین ہو گیا۔ گزرے ہوئے لمحوں کی یادیں خوشبودینے لگیں۔

گاؤں سے کچھ فاصلے پر آم کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ وہ یہاں گرمیوں کی چھٹیوں میں سارا سارا دن بیٹھ کر لکھتا پڑھتا رہتا تھا۔ جب جی چاہتا حساب یا الجبرے کے سوال نکالنے لگتا جب جی چاہتا لیٹ کر اور گاگا کر اردو یا انگریزی کی نظمیں یاد کرنے لگتا۔

یہ عام گزرگاہ نہیں تھی۔ بہت کم لوگ ادھر آتے تھے۔ ہاں ملک شہاب الدین کے گھر کے لوگ گاہے گاہے اپنے کھیتوں کی طرف آنے جانے کے لئے وہاں سے گزرتے رہتے تھے کیونکہ یہ کھیت اور زمین انہی کی ملکیت تھی۔ اس گھر کی ایک لڑکی رابعہ اس سے تین چار سال چھوٹی تھی جب کبھی وہاں سے اکیلی گزرتی ایک عجیب حرکت کرتی۔ جونہی وہ راستہ چلتی اس کے برابر پہنچی اچانک دوڑنے لگتی اور کوئی ایک کھیت دور تک سرپٹ دوڑتی چلی جاتی (جویں ہرنیاں ترٹھیاں باروچوں) اور وہ شرمندہ سا ہو جاتا۔ دور سے کسی کو شک

گزر سکتا تھا اس نے اسے پکارا یا آوازہ کسا ہے۔ اور اگرچہ وہ بہت خوبصورت اور سرخ و سفید تھی مگر بہت کم اور بھولی بھالی تھی اور اس نے کبھی اس سے بات کی تھی نہ اس کی خواہش ہی رکھتا تھا۔ وہ زیادہ تر پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتا۔ کورس کی کتابوں سے جی اکتا جاتا تو بچوں کی کتابیں اور رسالے پڑھنے لگتا۔ بعض اوقات اسے اس کے دوڑنے سے پتہ چلتا کہ وہ آیا جا رہی ہے اسے بڑی حیرت ہوتی سمجھ میں نہ آتا وہ ایسا کیوں کرتی تھی اور اس سے اسے کیا خوف تھا لیکن پھر جب وہ وہاں سے یوں تن کر گزرنے لگی جیسے کہہ رہی ہو ہمت ہے تو میرا راستہ روک کر دیکھو۔ لیکن اس میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکتا اسے دور سے آتا دیکھ کر وہ کتاب میں پناہ لیتا اور جب وہ کچھ فاصلے پر چلی جاتی تو پیچھے سے اس کا مروڑے کھاتا ہوا لک دیکھ دیکھ کر تھوک نکلتا رہتا۔

وہ ملکوں کی بیٹی تھی اور وہ ایک ادنیٰ چمار کا بیٹا۔ اس نے بہت چاہا اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دے۔ وہ اس کا انجام بھی جانتا تھا۔ ذرا سا بھی شک ہو گیا تو اس کی کھال کھینچ کر اس میں بھس بھر دیا جائے گا۔ کھڑے کھڑے سارے کنبے کو گاؤں سے نکلنے کا حکم دے دیں گے۔ مگر وہ خود کو تسلی دیتا رہتا کہ سوچنے سے کسی کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے اور کسی کو اس کا کیا پتہ چل سکتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں سوچ رہا ہے۔

ان دنوں وہ دن کو پڑھتا اور رات کو چھت پر لیٹ کر اختر شماری کرتا۔ رات جتنی تاریک ہوتی آسمان اتنا ہی روشن نظر آتا۔ جتنے ستارے اس نے اس زمانے میں اپنے گھر کی چھت سے آسمان میں دیکھے اتنے اس کے بعد کبھی کسی اور چھت پر نظر نہ آئے۔ شہر میں آ کر تو جیسے ستاروں سے تعلق ہی ٹوٹ گیا۔ کبھی چھت پر جانے کی نوبت نہ آتی اور آتی تو شہر کے ققموں کی روشنی میں گرد آلود آسمان میں گنے چنے ستارے دکھائی دیتے۔ پھیکے پھیکے اور بجھے بجھے سے۔ گاؤں والی چھت پر لیٹ کر تو اس نے ان سے بہت رسم و راہ پیدا کر لی تھی۔ شوخ اور روشن ستاروں سے تو آنکھ مٹکا لگا ہی رہتا تھا کہ ہر ایک میں جانی پہچانی صورت نظر آتی تھی مگر وہ بعض خالی جگہوں میں بھی ایسے دور افتادہ مدھم ستارے ڈھونڈ نکالتا جو کبھی ٹٹماتے کبھی بجھ جاتے یا نظروں سے اوجھل ہو جاتے اور وہ بڑی بڑی دیر تک ان کے دوبارہ نظر آنے کی امید میں ٹکٹکی لگائے گھورتا رہتا۔ اسے یقین ہوتا کسی نہ کسی ستارے پر ان کی نگاہیں ضرور ٹکرائی ہوں گی۔ چاندنی راتوں میں بے کلی اور بڑھ جاتی۔ چاند پر ملاقاتیں ہوتیں باتیں ہوتیں۔ اور وہ جاگتی آنکھوں سے رنگارنگ سپنے دیکھتا رہتا۔ جاگتا رہتا۔ (میں تارا تارا جاگوں تیرے نام)

پھر اس نے بچوں کے ایک رسالے میں بتائی ہوئی ترکیب سے چند کوئلیں اور تانبے کی تاریں جوڑ کر ایئر فون ریڈیو بنالیا۔ جو سون مکی یا سرے کی ڈلی سے چلتا تھا۔ ان دنوں ٹرانسسٹر کا کسی نہ نام نہیں سنا تھا۔ دیہات میں شاذ و نادر بیٹری کے ریڈیو سیٹ تھے۔

اس کے اپنے بنائے ہوئے ریڈیو میں خوبی یہ تھی کہ بجلی یا کسی بیٹری کی ضرورت تھی نہ کسی کو پتہ چلتا تھا کہ وہ ریڈیو سن رہا اور خرابی یہ تھی کہ بہت سے اسٹیشن ایک ساتھ سنائی دیتے تھے۔ ظاہر ہے قریب ترین اسٹیشن کی آواز نسبتاً صاف اور نمایاں ہوتی مگر بعض اوقات دوسری زبانوں کے طاقتور ریڈیو اسٹیشن اسے بھی دبا لیتے۔ ریڈیو سننے ہوئے ستاروں سے آنکھ مچولی کا کھیل اور بھی دلچسپ اور رنگین ہو جاتا وہ مدھر گیتوں کی دھن پر اجلا لباس پہنے مدھم اور شوخ ستاروں کے درمیان رقص کرتی پھرتی۔

پھر وہ اس کے گھر آنے جانے لگی۔

دیہات میں جسمانی خوبصورتی کا ہمیشہ قحط پڑا رہتا ہے۔ دھوپ میں کام کرنے والے مردوں عورتوں کا رنگ عموماً کالا پڑ جاتا ہے پھر تعلیم و تربیت کی کمی کی وجہ سے عورتیں خود کو سنبھال کر نہیں رکھتیں۔ لڑکیوں کو میک اپ کی عادت ہوتی ہے نہ اجازت۔ وہ عام طور پر موٹا جھوٹا کھا اور پین کر گزارا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کسی کے ہاں کوئی لڑکی پیدا ہو جاتی ہے تو سارے پنڈ میں پواڑے پڑ جاتے ہیں۔ (سارے پنڈ وچ پواڑے پائے ہائے فی تیرے گورے رنگ نے) ایک اتار اور صد بیمار کے مصداق اس کے بے شمار چاہنے والے اور امیدوار پیدا ہو جاتے ہیں۔ رابعہ کے ساتھ بھی یہی سلسلہ تھا۔ گاؤں کی چھوٹی ذات کے لڑکوں کی تو خیر ہمت نہیں تھی کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھیں مگر آس پاس کے دیہات کے ملکوں، بھٹیوں، کھڑلوں اور دوسرے زمیندار گھرانوں کے لڑکوں میں ایک خاموش سا مقابلہ جاری ہو گیا۔ ان بہت سے چاہنے والوں نے رابعہ کو مغرور بنا دیا تھا اور وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ لیکن پھر پتہ نہیں وہ کیسے اس پر مہربان ہو گئی۔ (بھکھ نہ کچھے سالناں تے عشق نے کچھے ذات) شاید اس لئے کہ وہ کالج میں پڑھتا صاف ستھرا رہتا تھا اور اس کے طور طریقے دوسروں سے مختلف تھے۔ وجہ کچھ بھی ہو وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے اور یہ پسندیدگی رفتہ رفتہ محبت یا عشق میں تبدیل ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کے لئے تڑپنے لگے۔

اس میں تو اس کی گلی میں جانے کی ہمت نہیں تھی مگر وہ دن میں اس کے گھر کے کئی کئی چکر لگانے لگی۔ یہاں تک کہ گاؤں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور ایک روز اس کی ماکانی ماں اس کے گھر آئی اور اس نے اس کی والدہ سے کہا۔

”رابعہ کا ابا کہتا ہے تمہارے بیٹے جیسا لڑکا ہماری برادری میں نہیں ہے اگر وہ ہماری ذات برادری کا ہوتا تو ہماری خوش نصیبی ہوتی مگر اب کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ تم اپنے لڑکے کو جلدی سے کہیں بھیج دو۔ رابعہ کے بھائیوں کو شک پڑ گیا ہے اور وہ اس کی تاک میں ہیں کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔“

اس کے ابا کو ساری صورت حال کا علم ہوا تو وہ پریشان ہو گئے اور اگلے ہی روز اسے شہر چلے جانے کا مشورہ دیا۔ اس کے سوا کوئی

چارہ بھی نہ تھا وہ شہر چلا آیا۔ پھر اسے ملازمت مل گئی اور وہ وہیں رہنے لگا۔ کبھی کبھار گاؤں جاتا مگر چھپ چھپا کر۔ ڈر رہتا کہ رابعہ کے بھائیوں سے سامنا نہ ہو جائے۔ وہ کسی بھی بہانے اسے اس کی بے عزتی کر سکتے یا کوئی انتہائی قدم اٹھا سکتے تھے۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اسے اس کے باپ کبھی ڈر نہ لگا۔ سامنا ہو جاتا تو وہ اس کے سلام کا جواب تو نہ دیتا مگر کبھی ناراضگی کا اظہار بھی نہ کرتا۔ آنکھیں چرا کر یا راستہ بدل کر چلا جاتا۔ اسے وہ اچھا لگتا تھا شاید اس لئے کہ وہ بھی رابعہ سے بہت محبت کرتا تھا۔

دیہات میں چھوٹی سی بات بھی بہت جلد پتنگ بن جاتی ہے۔ اخبار رسالوں کی کمی ایسی ہی چھوٹی بڑی خبروں اور افواہوں سے پوری کی جاتی ہے۔ اور کسی بھی چھوٹے بڑے واقعہ کی خبر آنا فنا دور دور تک پھیل جاتی ہے۔ بہت جلد رابعہ سے اس کے عشق کے چرچے ہر جگہ ہونے لگے۔ ہر کوئی اس میں اپنی طرف سے تھوڑا سا اضافہ کر دیتا۔ بعض تو دونوں کی باہمی ملاقات کو چشم دید بتاتے۔ اس لئے رابعہ کا رشتہ مانگنے والوں پر اس سی پڑ گئی اور صاحب حیثیت خاندان اسے اپنی بہو بنانے سے ہچکچانے لگے۔

اس کے ابا صدیق قیام پاکستان سے پہلے آگرہ کے نواح میں چمار کا کام کرتے تھے۔ پاکستان آ کر وہ کافی عرصہ تک ادھر ادھر بھٹکتے رہے پھر اس گاؤں میں آ کر آباد ہو گئے اور اپنا آبائی پیشہ اختیار کیا۔ وہ چمڑا رنگتے جو تیاں بناتے اور کبھی کبھار گائے یا بھینس ذبح کر کے اس کا گوشت بیچتے۔ شروع میں ان کی زبان بے حد مختلف تھی مگر اب وہ بڑی روانی سے مقامی زبان بولتے تھے اور اپنی زبان تقریباً بھول چکے تھے۔

یہ اعوان زمینداروں کا گاؤں تھا۔ جو ملک کہلاتے تھے۔ گاؤں میں ان کے علاوہ کسی اور برادری کے زمیندار نہیں تھے۔ البتہ چھوٹی ذات کے کیوں کے کچھ گھر تھے جو سیپ یعنی غلے کی صورت میں سالانہ اجرت پر ان کی خدمت کرتے تھے۔ اور مختلف پیشوں سے وابستہ تھے۔ اس کے ابا ہجرت کے وقت لٹ لٹا کر پاکستان آئے تھے۔ ان کا سارا خاندان ان کی آنکھوں کے سامنے تہ تیغ ہو گیا تھا۔ انہوں نے یہاں آ کر ساتھ والے گاؤں کے ایک موچی کی بیٹی سے نکاح کر لیا تھا جس کے بطن سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس کی دونوں بہنیں شادی کے بعد اپنے اپنے سرسالی گاؤں چلی گئی تھیں وہ سب سے چھوٹا تھا۔ ابا اسے اعلیٰ تعلیم دلا کر شہر بھیج دینا چاہتے تھے جہاں ذات برادری کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور تعلیم اور آدمی کی ذاتی خوبیاں نظر انداز نہیں کی جاتی تھیں۔

اس کے ابا کا کاروبار اچھا چل رہا تھا اس کے بنائے ہوئے طے دار کھسوں کی دور دور تک مانگ تھی ادھر بیٹے کی تنخواہ بھی آنے لگی تو گھر کے حالات کافی اچھے ہو گئے اور ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ لیکن وہ جانتا تھا اگر انہیں قارون کا خزانہ بھی مل جائے تو بھی رابعہ سے اس کی شادی کا خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا تھا وہ ملکوں کی نظر میں چمار ہی رہتے۔

ایک روز وہ کسی طرح چھپ چھپا کر اسے ملنے آئی اور کہنے لگی۔

”کیا یہ ذات برادری کا چکر کسی طرح ختم نہیں ہو سکتا؟“

”ناممکن ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں ملک بن سکتا ہوں نہ تم چمار بن سکتی ہو۔“

”کاش میں چماروں میں پیدا ہو گئی ہوتی۔“

”یہ تمہیں اس وقت سوچنا چاہیے تھا۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”تم تو سمجھدار تھے تم ہی ادھر ملکوں میں پیدا ہو جاتے۔“

”مجھے پتہ نہی تھا تم ادھر پیدا ہو جاؤ گی میں پہلے آ گیا تھا۔“

”اچھا جی غلطی ہو گئی۔ آئندہ ایسا نہیں کروں گی۔“

”اب غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔“

”اڑیا میرے لئے تو تم اب بھی ملک ہو۔“ وہ بولی ”اچھا یہ بتاؤ یہ ملک تو جس سے چاہے بیاہ کر لیتے ہیں۔ وہ چاچا سدو نے بختو

ماچھن سے نہیں کیا تھا؟“

”وہ مالک اور مختار ہیں اور کی ان کی رعایا اور ملکیت۔ انہیں اختیار ہے۔“

”یہ ذات برادری کا چکر کس نے شروع کیا؟“

”جن کے پاس طاقت اور اختیار تھا۔ عین ممکن ہے آج کے کسی یا مزارعے اور حقیر سمجھے جانے والے بیشتر لوگ کبھی ان زمینوں

کے اصل مالک رہے ہوں۔ جنہیں باہر سے یا دوسرے علاقوں سے آنے والوں نے طاقت یا چالاکی سے بے دخل کر دیا ہو اور خود

مالک بن بیٹھے ہوں۔ شروع میں دستکاروں اور مختلف پیشوں سے وابستہ لوگوں کو حقیر نہیں سمجھا جاتا تھا۔“

”ہاں“ وہ بولی ”یوں تو سب انسان برابر ہیں۔ سب باوا آدم کی اولاد ہیں۔“

”مگر وقت نے ہمارے درمیان بہت فاصلہ پیدا کر دیا ہے۔“

”کیا ہوگا؟“

”ہمیں ایک دوسرے کو بھول جانا ہوگا۔“

”پھر تمہارے پڑھنے لکھنے کا کیا فائدہ؟“

کرنے کا حکم دیا گیا مگر وہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ رات کا وقت تھا وہ چھپتا چھپاتا دوڑ نکل گیا۔ لیکن تعاقب کرنے والوں نے بھی ہمت نہ ہاری۔ چند کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آیا اس نے گاؤں کے باہر ایک چھوٹے سے مکان میں پناہ لی۔ وہاں ایک بوڑھا چمار اور اس کی بیٹی رہتے تھے۔ آدھی رات کے وقت ایک نوجوان دیوار پھاند کر گھس آیا تو وہ ڈر گئے مگر جب اس نے سارا واقعہ سنایا اور پناہ مانگی تو بوڑھے نے جو مسلمان تھا اسے پناہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور جلدی سے ایک تیسرا بستر بچھا کر اسے لیٹ جانے کا مشورہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد تعاقب کرنے والے بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے گاؤں کے ہر گھر کی تلاشی لی وہ بوڑھے چمار کے ہاں بھی آئے۔ بوڑھے نے دروازہ کھول دیا اور بولا ”یہاں کوئی نہیں آیا۔ گھر میں میرے علاوہ میری بیٹی اور داماد سو رہے ہیں۔ آپ لوگ تلاشی لے سکتے ہیں۔“

تعاقب کرنے والے تلاشی لے کر چلے گئے تاہم انہوں نے بوڑھے کی بیٹی اور داماد کو قریب قریب چار پائیوں پر سو رہے تھے جگانا مناسب نہ سمجھا۔

صبح ہوئی تو وریام نے شکریہ ادا کر کے اجازت چاہی مگر بوڑھے نے کہا ”میں نے تمہاری جان بچانے کے لئے مصلحتاً تمہیں اپنا داماد بنا لیا۔ اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم میری بیٹی سے عقد کر لو اور سچ مچ میرے داماد بن جاؤ اور کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاتے رہو۔“

وریام نے اس نیک دل بوڑھے چمار کی پیش کش قبول کر لی اس کا وطن بہت دور رہ گیا تھا اور سارا ملک فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں تھا وہ وہیں رہنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اولاد دی اور اس طرح ایک پیڑ جو اپنی اصل جگہ سے اکھڑا گیا تھا۔ ایک دور افتادہ علاقے میں نئے سرے سے ہرا ہو گیا اور پھل پھول دینے لگا۔ وریام زندگی بھر اپنے وطن کی یاد میں تڑپتا اور لوٹنے کے خواب دیکھتا رہا مگر اس کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔

میں اسی وریام کی اولاد میں سے ہوں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ واپسی کے سفر میں میں بھی لٹ لٹا کر اکیلا یہاں پہنچ سکا۔“ صدیق کی باتیں سن کر ملک بھونچکا رہ گئے۔ انہیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ یہ سب سچ تھا۔ انہوں نے طرح طرح کے سوالات سے اسے پریشان کیا مگر صدیق کے پاس بھی ہر بات کا جواب موجود تھا۔

اس واقعے کا ہر گھر میں چرچا ہونے لگا۔ پھر آس پاس کے دیہات میں بھی ہر جگہ اس موضوع پر بحث مباحثے ہونے لگے۔ آخر کار برادری کے سرکردہ لوگوں نے اپنے جدی پشتی میراثی کو بلا بھیجا جس کی تحویل میں ان کا شجرہ نسب تھا اور جو سال چھ ماہ بعد شیرینی

لینے آتا اور فرمائش پر پیڑھیاں پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔

گاؤں کے ملک حیران رہ گئے جب میراثی نے تصدیق کر دی کہ واقعی گاؤں کے اعمانوں کے ایک بزرگ کبیر کے دو بیٹے تھے۔۔۔۔۔ انعام اوروریام۔ وریام کو نو عمری میں حملہ آور پکڑ کر لے گئے تھے اس لئے اسے لا ولد قرار دیا گیا مگر انعام کی نسل آگے بڑھی اور اب گاؤں کے سارے ملک اسی کی اولاد سے تھے۔

بہت سی بحثوں، مباحثوں اور اس یقین دہانی کے ساتھ کہ وہ لوگ زمینوں اور جائیدادوں سے کوئی حصہ طلب نہیں کریں گے اور چماروں کا کام فوراً ترک کر دیں گے انہیں اعمان برادری میں شامل کر لیا گیا۔ اس پورے علاقے میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور انوکھا واقعہ تھا۔

رابعہ سے اس کی شادی کی راہ ہموار ہو گئی تھی مگر رابعہ کے والدین تامل کرتے رہے۔ آخر اس کے ابا نے جواب ملک صدیق کہلاتے تھے انہوں نے برادری کے سرکردہ لوگوں سے سفارتوں اور سفارشوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور آخر کار رابعہ کے والدین رضا مند ہو گئے۔ اس کی شادی نہایت دھوم دھام سے ہو گئی اور وہ شہر میں آکر ہنسی خوشی رہنے لگے۔

گھریلو جھگڑا کہاں نہیں ہوتا۔ ایک روز کسی بات پر ان میں تو تو میں میں ہو گئی۔ غصے میں اس نے اے گنوار کہہ دیا تو رابعہ نے اسے چمار ہونے کا طعنہ دیا۔ جس پر دونوں میں بول چال بند ہو گئی۔ اور وہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے سے دور دور ہو گئے۔

وہ چونک پڑا۔

دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ اس نے یسپ جلا کر گھڑی دیکھی۔ چار بج رہے تھے۔ یقیناً وہ رابعہ تھی۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ مگر وہ وقفوں وقفوں سے دستک دیئے چلی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہا اسے آواز دے کر بتائے کہ دروازہ بند نہیں ہے مگر اس نے بولنے کے بجائے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

وہ اندر آئی۔ اس نے دیکھا وہ بہت مغموم اور تھکی ہوئی تھی۔ میت کے پاس بیٹھ کر روتے اور جاگتے رہنے سے اس کی آنکھیں سو جھی ہوئی تھیں۔ اس نے آتے ہی سر کو دوپٹے سے باندھ لیا اور لیٹ گئی۔ یقیناً اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ محبت، ہمدردی اور اپنائیت کی ایک لہر آئی اور اس بھگو گئی۔ اس نے باورچی خانے کا رخ کیا اور تھوڑی دیر بعد اس کے لئے چائے بنا کر لے آیا۔ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پھر بولی۔

”آپ کو میرا کتنا خیال ہے تو مجھ سے بولتے کیوں نہیں؟“

”تم بلاؤ تو بولو۔“

”خود نہیں بول سکتے؟“

”جب میں چپ ہوتا ہوں۔“ اس نے کہا ”تو بھی اندر ہی اندر تم سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔“

”سچ؟“

”ہاں میں رات بھر تجھے یاد کرتا رہا۔“

اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ بولی ”میں بھی کتنی پاگل ہوں آپ مجھے ملاکافی بنانا چاہتے ہیں اور میں چمارن بننے پر مصر ہوں۔“

”اصل میں تمہیں شک ہے۔“

”کیا؟“

”یہ کہ میں نے تم سے شادی کرنے کے لئے اپنے ابا اور ملکوں کے میراثی سے مل کر یہ سارا چکر چلایا۔“

”کون کیا چکر چلاتا رہا ہے اور کون پہلے کیا تھا مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ وہ بولی۔ ”کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہمارا میل ہو گیا جو بظاہر نامکن بات نظر آتی تھی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ سب کچھ کوئی فرضی کہانی نہیں تھی۔“

”دوسری باتوں کا تو مجھے پتہ نہیں۔“ وہ بولی ”لیکن میرے ابا نے تمہارے ابا کی بات کو سچ ثابت کرنے کے لئے میراثی کو ایک لیاری بھینس انعام میں دی تھی۔“

وہ حیرت سے اس کا منہ تکتے لگا۔



بکری شیر اور گھاٹ

آپ نے دریا پار کرنے کے سلسلے کا وہ معمہ یا پہیلی ضرور پڑھی سنی ہوگی جس میں ایک ایک شخص کے پاس ایک شیر، ایک بکری اور گھاس کا ایک گٹھا ہوتا ہے اور اسے دریا پار کرنا ہوتا ہے مگر کنارے پر ایک چھوٹی سی کشتی ہے جس میں صرف اتنی گنجائش ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک چیز ہمراہ لے کر دریا عبور کر سکتا ہے۔ وہ شیر اور بکری اور گھاس کو بھی ایک طرف نہیں چھوڑ سکتا۔

یہ معمہ بہت پرانا ہے اور معلوم ہوتا ہے اگلے وقتوں میں شیر اور بکری مالک کے بہت وفادار ہوتے تھے وہ باندھ کر نہیں رکھتا تھا پھر بھی ان کے بھاگ جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا اور وہ کم از کم اس کی موجودگی میں ایک گھاٹ پر پانی پی لیتے تھے۔ شیر بکری کو کھانا ضرور چاہتا تھا مگر لگتا ہے ان دنوں شیر کی آنکھ میں حیا تھی کہ وہ مالک کے سامنے بکری کو چیرتا پھاڑتا نہیں تھا اور بکری بھی اتنی فرمانبردار اور صابر ہوتی تھی کہ اسے بھوک لگی ہوتی مگر مالک منع کر دیتا تو منع ہو جاتی اور کم از کم اس کی نظروں کے سامنے منہ نہ مارتی تھی۔

آپ جانتے ہیں کہ اس پہیلی یا معمے کو حل کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ آدمی سب سے پہلے بکری کو اپنے ساتھ لے جائے اور دوسرے کنارے پر چھوڑ آئے بشرطیکہ وہاں کوئی دوسرا شیر، چیتا یا بھیڑ یا پہلے سے گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ اس طرح پہلے کنارے پر شیر اور گھاس کا گٹھا رہ جائیں گے ظاہر ہے شیر خواہ کتنا ہی بھوکا کیوں نہ ہو گھاس نہیں کھا سکتا۔ گھاس بری چیز نہیں ہے ہم میں سے زیادہ تر لوگ گھاس پھوس کھا کر ہی زندگی گزارتے ہیں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ شیر ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے معلوم ہے کہ جس روز اس نے گھاس کھالی وہ دھاڑتا بھول جائے گا اور صرف ہنہنا کر رہ جائے گا۔ بہر حال جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ معمہ کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے البتہ اس میں شیر، بکری اور گھاس کو حفاظت سے دوسرے کنارے پر لے جانے کے لئے سات مرتبہ دریا پار کرنا پڑتا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ سات چکر کچھ زیادہ ہوتے ہیں۔ اصل مسئلہ حفاظت سے پار اترنے کا ہے۔ سو یعقوب علی عرف قوبا بھی حفاظت سے دریا پار کرنا چاہتے ہیں مگر پڑھا لکھانہ ہونے کی وجہ سے ترکیب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔

یوں تو بے کا مسئلہ شیر بکری اور گھاس والے معمے سے ذرا مختلف بھی ہے۔ اس کے پاس گھاس بہت ہے مگر اسے یہ گھاس کہیں لے جانی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی بکریاں گھاس کھا سکتی ہیں۔ اس کے پاس دو بکریاں ہیں اور شیر اس نے چڑیا گھر میں دیکھا ہے۔ لیکن اسے ایک ان دیکھے شیر کا خوف ضرور پریشان کرتا رہتا ہے جو اس کے خیال میں پہیلی والے پالتو شیر جیسا اکیل نہیں ہے کہیں اس پاس

کھلا پھرتا ہے یا گھات لگائے بیٹھا ہے کہ ادھر اس کی آنکھ لگے اور ادھر وہ کسی بکری پر چھپے۔ صرف ایک بکری پر اس لئے کہ شیر خواہ کتنا ہی خونخوار اور وحشی ہو ایک وقت میں دو بکریوں کو قابو نہیں کر سکتا۔

دونوں پہیلیوں میں ایک فرق یہ ہے کہ قوے کی بکریوں کو جن کے نام شیداں اور مہراں ہیں، ایک دوسری سے اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں جیسا شیر بکری اور گھاس والے شخص کو درپیش تھا کہ گھاس لے کر جاتا ہے تو پیچھے شیر بکری کو کھاجاتا ہے اور شیر کو ہمراہ لے جاتا ہے تو بکری گھاس چٹ کر جاتی ہے۔ بلکہ قوے کی بکریاں تو ایک دوسری کی رکھوالی کرتی رہتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بات کی شکایت اس تک پہنچاتی ہیں اور یوں ان دونوں کی نگرانی خود بخود ہو رہی ہے۔ وہ انہیں ایک دوسری کے حوالے کر کے سارا دن مزدوری کرنے چلا جاتا ہے اور اسے کسی قسم کی فکر نہیں ہوتی۔ یوں بظاہر قوے کو کوئی دریا بھی پار نہیں کرنا ہے۔ سوائے زندگی کے اس دریا کے جو ہر زندہ شخص کو خواہ وہ کسی بھی وجہ سے وہ دنیا میں آگیا ہو درپیش ہوتا ہے۔ اور جسے بعض لوگ تو موٹر بوٹ یا سٹیمر میں بیٹھ کر عبور کر لیتے ہیں مگر بعض چپو چلا چلا کر ہلکان ہوتے رہتے ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ دریا مشکیزوں اور گھڑوں کے ذریعے پار کرنا پڑتا ہے ہاں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں کچے گھڑے میں میسر نہیں آتے مگر ان کا پار جان ضروری ہوتا تو وہ کچے گھڑوں پر بھی ٹھل پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کچے گھڑے دریا میں تھوڑی دور جا کر کھر جاتے ہیں تاہم ان کے جذبوں کی صداقت اور وفا کبھی نہیں کھرتی اور زیادہ پختہ ہو جاتی ہے۔ خوشبو بن کر دور دور تک پھیل جاتی ہے، صدیوں پر محیط ہو جاتی ہے۔

دریا تو کیا، قوے کو تو وہ گندہ نالہ بھی پار کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی جس کے کنارے وہ کئی برسوں سے رہ رہا ہے اور اگر کبھی سے یہ نالہ پار کرنا پڑ جائے تو اسے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اس نالے پر کئی جگہ سینٹ کنکریٹ کی سلوں کے فٹ برج سے بنے ہوئے ہیں اور پھر عام دنوں میں وہ زیادہ چوڑا اور گہرا نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی رفتار تیز ہوتی ہے وہ شہر کے ایک تہائی حصے کی گندگی اور تعفن سمیٹے چپ چاپ اپنے پختہ کناروں کے اندر نظر نہ آنے والی رفتار سے بہتا رہتا ہے صرف برسات کے دنوں میں اس میں طغیانی آتی ہے اور وہ اس بہانے قریبی گلیوں اور مکانوں میں جھانک آتا ہے۔

عام دنوں میں اس کے دونوں کناروں پر بھینسیں بندھی رہتی ہیں کیچڑ اور گوبر کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ اطراف کی دیواریں اپلوں سے اٹی رہتی ہیں۔ مکھیوں اور مچھروں کی بھرمار ہوتی ہے اور بدبو کے بھبھوکے اٹھتے رہتے ہیں مگر یہ گندنا نالہ نہیں تھا گندگی اور غلاظت تو اس میں بعد میں پھینکی جانے لگی اور اسے گندا کر دیا گیا اس میں سیوریج کے پائپ اور گندی مورییاں ملا دی گئیں۔ اور چھتوں سے گندگی لے کر اترنے والے پرنا لے اس میں ڈال دیئے گئے اور اگر دیکھا جائے تو گندی نالیاں اور پرنا لے بھی خود گندے کہاں

ہوتے ہیں انہیں گندا کر دیا جاتا ہے۔ جب پہلے پہلے پہل نالی بنائی پائپ بچھایا اور پرنا لے کو پورٹ لینڈ سینٹ اور دریائی ریت سے پلستر کر کے گر مالہ لگایا جاتا ہے تو وہ کتنا پاک صاف اور شفاف ہوتا ہے۔ گندگی تو ان سب پر اوپر سے تھوپی جاتی ہے۔ سو یہ گندا نالہ بھی کبھی اچھا نالہ رہا ہوگا۔ پہاڑوں، جنگلوں اور کھیتوں سے برساتی پانی لے کر بڑے نالے میں پہنچا ہوگا مگر اب یہ ان گنت مکانوں، نالیوں اور گٹروں کی غلاظت سمیٹے زیر زمین چلتا رہتا ہے اور اس کے اوپر چلنے پھرنے والوں کو احساس تک نہیں ہوتا کہ ان کے پاؤں کے نیچے کیسی کسی خوفناک مخلوق اور کیا کیا غلاظتیں بہتی چلی جا رہی ہیں پھر اس جگہ سے جہاں تو با اس کے کنارے ایک تنگ سی گلی میں رہتا ہے یہ نالہ اچانک ایک پل کے نیچے سے نمودار ہوتا ہے اور ایک پختہ اوپن ڈرین کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ تو با ایک عرصے سے گندے نالے کے کنارے رہتا ہے مگر وہ گندگی اور بدبو سے ابھی تک سمجھوتہ نہیں کر پایا۔ وہ نالے کی طرف بہت کم جاتا ہے اور جب بھی اس کا ادھر سے گزر ہوتا ہے اسے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ گندے پانی میں کوئی پتھر نہ پھینک دے۔ اگر کبھی کوئی چھیننا اس پر آپڑے تو نالہ پانی کا احساس اس کے ذہن سے کئی روز تک چپکا رہتا ہے وہ عموماً سڑک کی طرف سے آتا اور اسی طرف سے کام پر جاتا ہے۔ اس کی گلی پل سے کچھ فاصلے پر پکی سڑک سے شروع ہوتی ہے پھر بل کھاتی ہوئی جلد ہی نالے میں اتر جاتی ہے جہاں لوگوں نے کوڑا پھینک پھینک کر ڈھلوان سی بنادی ہے جو گزرنے والوں کے لئے سیرھی کا کام دیتی ہے۔ نالے کے آس پاس رہنے والوں کے لئے یہ گلی ایک شارٹ کٹ کا کام دیتی ہے اور اگرچہ یہ نہایت ہی تنگ سی گلی ہے اور اس میں گنتی کے چند ایک دروازے ہی کھلتے ہیں مگر اس کے عین وسط میں ایک موڑ سا ہے جہاں تھوڑی سی کشادہ جگہ ہے اور اس طرح وہاں ایک جھونپڑی کی گنجائش نکل آئی ہے مگر چونکہ گزرنے والوں کے لئے تین چار فٹ چوڑا راستہ چھوڑنا ضروری ہے اس لئے جھونپڑی دو غیر مساوی حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک طرف دو چار پائیوں کے برابر مثلث نما کھڑا ہے اور دوسری طرف ایک چار پائی کی جگہ۔ مثلث نما حصے پر کریٹوں کی پھٹیوں، ٹین کی چادروں اور گھاس پھوس کی مدد سے چھت ڈال دی گئی ہے مگر گلی کے اس پار ایک چار پائی والے حصے کی چھت کا کام قریبی مکان کا چھجا دیتا ہے۔ تین سے زیادہ چار پائیاں بھی گرمیوں میں صرف رات کو بچھائی جاتی ہیں اور شاید رات کو بھی وہ چار پائیاں کبھی نہ بچھاتے اگر نالہ اس قدر گندا اور قریب نہ ہوتا۔ اب وہاں رات کو اکثر سانپ سرسراتے، بچھورینگتے، مینڈک پھدکتے، چوہے دوڑتے اور چھچھوندیں چیختی پھرتی ہیں۔ سانپ کے بارے میں انہیں بھی خوش فہمی ہے کہ اسے چار پائی پر چڑھنے اور ڈسنے کی اجازت نہیں ہے اگرچہ بعض سانپ نافرمان بھی ہو سکتے ہیں مگر خوش فہمیاں بعض اوقات زندگی کو کتنا آسان بنا دیتی ہیں۔

دیکھتا ہے کہ کہیں کوئی چوتھی چار پائی تو آپ ہی آپ وہاں نہیں بچھ گئی۔ جو نہی کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ اسے لگتا ہے ابھی کوئی آدم خور حملہ کر دے گا اور اس کے منع کرتے کرتے اور ہتھیار سنبھالتے سنبھالتے بکری کو بھنبھوڑ کر جنگل کی راہ لے گا۔

مہراں کا رنگ گندمی اور شکل و صورت نہایت معمولی ہے مگر اس کا میلا کچھلا اور بدبودار لباس بھی اس کے منہ زور بدن کی خوشبو کو نہیں چھپا سکتا۔ وہ دن بھر اپنے تھاپتی نالیاں صاف کرتی اور کچھڑ میں لت پت رہتی ہے اور اس کے پاس سے بساندی آتی ہے بشرطیکہ آدمی گندے نالے کی طرف سے ہو کر نہ آیا ہو یا وہاں کا رہنے والا نہ ہو۔ پھر بھی وہ سوچتا ہے کہ جس معاشرے میں جوان لڑکیوں کی بے حرمتی کا ان کے مرنے کے بعد بھی خطرہ ہو وہاں بدبو کا حصار کہاں تک تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔ خصوصاً جب ایک جوان غیر شادی شدہ اور بولائی ہوئی عورت عین گلی کے اندر بے سدھ ہو کر سوتی ہو اور جہاں سے طرح طرح کے بھیڑیے آدمیوں کا گزر ہوتا ہو۔ بھیڑیا شکار کو ہڑپ نہ بھی کر سکے اسے زخمی اور لہو لہان تو کر سکتا ہے۔ پنچے مار کر نہ مننے والے نیل اور داغ تو ڈال سکتا ہے۔ پھر اس آبادی کے اکثر اوباش لڑکوں کے ہاتھ ان کے قابو میں نہیں ہیں۔

وہ بے حد تھکا ماندہ ہوتا ہے اسے سخت نیند آ رہی ہے مگر کسی کے تیز یا آہستہ قدموں کی چاپ اس کی نیند اڑا دیتی ہے۔ راگبیر عموماً دونوں جانب کچھی چار پائیوں سے بچنے کے لئے رفتار آہستہ کر لیتے یا لمحہ بھر کے لئے رک جاتے ہیں تو اس کی بندھوتی آنکھیں چو پٹ کھل جاتی ہیں۔ پھر بد قسمتی سے دو ایک سینما ہاؤس قریب ہی واقع ہیں اور اس آبادی کے لفنگلوں کو آخری شوق دیکھنے کی عادت اور شوق ہے چنانچہ رات بھر آہٹیں آتی جاتی رہتی ہیں اور وہ رات کے پھیلے ہوئے دریا میں ہاتھ پاؤں مار مار کر نڈھال ہوتا رہتا ہے۔

ایک بار شیداں کو پتہ نہیں کیا سوچھی۔ اس نے گلی کے مثلث نما حصے اور گلی کے درمیان ایک چھوٹا سا پردہ لٹکا دیا۔ پہلے تو اسے عجیب راحت آمیز تھلنے کا احساس ہوا مگر جب مٹی کے تیل کا دیا بجھا اور رات کا اندھیرا پھیلنا تو اسے لگا مہراں اور دور جا پڑی ہے۔ جیسے اس کے اور ان کے درمیان گھنا تاریک جنگل آگ آیا ہوا گر شیر چیتا یا بھیڑیا حملہ کر دے کوئی نافرمان سانپ چار پائی پر چڑھ آئے تو اس کی کراہ تک سنائی نہ دے۔ اس نے شیداں کو پردہ ہٹا دینے کا مشورہ دیا۔ مگر بعض خنک چاندنی راتوں میں اس کا خود جی چاہتا ہے وہ پردہ اور موٹا اور گہرا ہو جائے پختہ دیوار میں تبدیل ہو جائے۔ اس نے کئی بار سوچا ہے کہ ان دونوں کو ایک طرف چھوڑ کر خود گلی کے ایک چار پائی والے حصے میں سونا شروع کر دے مگر اس سے کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا۔ گزرنے والوں کے لئے گلی کے اس یا اس پار ایک جتنا فاصلہ ہے ہاں اگر مہراں مثلث حصے کی دیوار کے ساتھ سونا شروع کر دے تو دوسری بات ہے مگر اس طرح شیداں کو درمیان والی چار پائی پر سونا پڑے گا اور وہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر شیداں کے بدن سے ہوا کا جھونکا بھی چھو جائے تو وہ پھر جاتا ہے۔

درخت آدمی

غیر متوقع واقعات اور حادثات چاہے سیدھے سادے اور دونوک ہی کیوں نہ ہوں ٹھوس شواہد کی عدم موجودگی ان میں شک و شبہ اور پراسراریت پیدا کر دیتی ہے اور جب ایک بار کرید کا سلسلہ شروع ہو جائے تو کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے۔ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ واقعات اور زیادہ پراسرار معلوم ہونے لگتے ہیں اور شکوک و شبہات بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔

اس کا نام کر مو تھا اور وہ نہروالے باغ کا مالی تھا۔

اور جب سے نہروالہ باغ اجڑا تھا چھوٹے چودھری صاحب اسے اپنے پاس اسلام آباد بلا رہے تھے مگر کئی پشتوں سے گاؤں کی زمین میں دھنتے دھنتے اس کی جڑیں اتنی گہری ہو گئی تھیں کہ اب مٹی اسے چھوڑتی تھی نہ وہ کسی شجر کی طرح وہاں سے حرکت کر سکتا ہے۔ چھوٹی بیگم کو اس کی بیٹی دارو کا کام اور سکھڑا پاپند تھا اور وہ ہر قیمت پر اسے اپنے ساتھ شہر میں رکھنا چاہتی تھی وہ خود بھی شہر جانا چاہتی تھی۔ یہاں اس کے سامنے ساری گلیاں بند تھیں اور بیوگی کا زخم مندمل ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ مگر وہ اپنے بوڑھے باپ کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جاسکتی تھی۔

انہوں نے کر مو کو لالچ بھی دیا کہ روٹی کپڑے اور رہائش کے علاوہ باپ بیٹی کو اچھی تنخواہ بھی دی جائے گی اس نے نقدی کی صورت کبھی کچھ نہیں لیا تھا۔ ہر فصل پر اسے غلے کی صورت میں معاوضہ مل جاتا۔ شادی غمی کے موقعوں پر بھی بڑے چودھری صاحب خود ہی خرچ کرتے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا وہ تنخواہ کے پیسوں کا کیا کرے گا۔ بڑی بیگم نے بھی اسے سمجھایا اور کہا کہ وہ پیسے جمع کر کے دوبارہ بیٹی کا گھر آباد کر سکتا ہے یا حج پر جاسکتا ہے مگر شاید درختوں کے درمیان زندگی گزارتے گزارتے اس کا دماغ کاٹھ کا ہو گیا تھا اسے نفع و نقصان کا اندازہ ہی نہ ہوتا۔

اسے باغ کٹ جانے کا بہت دکھ تھا اس نے بہت مخالفت کی تھی مگر اس کی کون سنتا تھا جب تک بڑے چودھری صاحب زندہ تھے باغ بھی قائم رہا مگر اس چھتار کے گرتے ہی آپودھانی پڑ گئی سب کچھ تقسیم ہو گیا زمین ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ منجھلا بیٹا شہر میں سرکاری افسر تھا باغ اور اس کے ارد گرد کی زمین اس کے حصے میں آئی۔ اس نے کچھ ہی عرصہ بعد باغ کنوا کرواں گندم کاشت کرادی جس سے باغ کے مقابلے میں خوب منافع ہونے لگا۔ مگر کر مو کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ وہ باغبان سے ایک معمولی کھیت مزدور بن گیا اور

باغ کی بجائے مویشیوں کے باڑے میں رہنے لگا تھا۔ داروبھی ٹوکریوں میں پھل جمع کرنے اور پھولوں کلیوں کے ہار اور گلدستے بنانے کی بجائے اپنے تھاپے، برتن، مٹھنے اور جھاڑو دینے لگی۔ کرمو کو ایسا لگتا جیسے اسے ایک بار پھر باغ بہشت سے نکال کر زمین پر پھینک دیا گیا ہو۔ اس بار بھی اس کے جنت سے نکلنے کا باعث دانہ گندم ہی تھا۔

کرمو اگرچہ اب ایک عام مزدور تھا مگر گھروں، کھیتوں اور قبروں کے سرہانے درخت لگانے کے لئے گاؤں کے لوگ اب بھی اس کے مشورے اور خدمات حاصل کرتے تھے۔ سارے گاؤں میں درختوں سے اس کی دلچسپی محبت اور واہموں کے طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ درخت اس کہنا مانتے اور اس کی باتیں سمجھتے تھے۔ بہر حال یہ ضرور باور کیا جاتا تھا کہ اس کا لگایا ہوا درخت یا پودا کبھی مرجھاتا نہیں تھا اور دوسروں سے زیادہ پھلتا پھولتا تھا۔ درختوں کے بارے میں اس کی معلومات بھی خاصی وسیع تھیں اسے اپنے باغ یا گاؤں کے درختوں کے علاوہ پورے علاقہ کے قابل ذکر درختوں کے بارے میں پتہ رہتا کہ کون سا درخت ٹوٹ یا کٹ چکا ہے کون سا کس حال میں ہے۔

درخت کرمو کی کمزوری تھی وہ کسی بھی قسم کے درخت کو کٹتے یا گرتے نہ دیکھ سکتا تھا وہ باغ کے درختوں کی چھنگائی بھی اس احتیاط سے کرتا جیسے ماہر حجام بال تراشتے ہیں۔ جب کبھی وہ کسی درخت کے کٹنے کی خبر سنتا اسے اتنا ہی صدمہ ہوتا جتنا کسی عزیز کے مرنے پر ہو سکتا ہے۔

باغ کے درخت تو اسے مثل اپنے بزرگوں، دوستوں اور بیٹوں کے عزیز تھے اس کے علاوہ گاؤں کے بعض درختوں سے اسے خاص لگاؤ تھا جن میں چوپال کا بوڑھا برگد شامل تھا جس کے سائے میں گرمیوں کی دوپہروں کو آدمی اور مویشی پناہ لیتے اور ڈھولے اور واریں گانے کی محفلیں جیتی تھیں۔

لوہاروں کے خراس کے پاس پھر دانہ کا ایک بڑا درخت تھا تیز ہوا چلتی تھی تو اس کے اندر ایک ساتھ ان گنت سارنگیاں سی بجنے لگتیں وہ ایک طرح سے باد پیتا تھا۔ ہوا کی رفتار کے ساتھ کبھی شوکتا کبھی پھنکارتا۔ ہوا مدھم ہوتی تو بھی اس کے سسکارنے اور سانس لینے کی آواز سنائی دیتی رہتی۔

یوں تو چودھری اللہ وسایا کی بہو کے حسن و جمال کی بڑی دھوم تھی مگر اس کے آنگن میں ایک خوبصورت بکائُن بھی تھی جسے دیکھ کر لگتا گویا ہرے رنگ کی ایک بڑی سی چھتری سیدھی جنت سے اتری اور اپنے ہی وزن سے زمین میں دھنسی کھڑی ہو۔ کھروں کے آموں کے جھنڈ نہر کے شیشموں کی قطاروں اور نمبردار کی رکھ (ذخیرے) کو تو ہر صاحب ذوق پسند کرتا تھا لیکن کرمو کو تو مسجد کے پچھواڑے

والے میدان کے دن کے درخت بھی عزیز تھے جو نہایت بد وضع اور ٹیڑھے میڑھے تھے۔ بعض تو زمین پر ادھ موئے سے لیٹے ہوئے تھے ان کی کھوؤں میں تو توں کے بچے ملتے اور سانپ چھپے رہتے تھے۔ ان دنوں کو پیلو لگتے تھے نہ ان کی لکڑی ہی اچھی تھی۔ سوختی نہ فروختی البتہ لڑکے بالے دن بھر یہاں کرل کا نگھا کھیلتے اور ادھم مچائے رکھتے تھے کیا پتہ کرمو کو ان میں اپنے پیدا نہ ہو سکنے والے لڑکوں کی صورتیں نظر آتی ہوں۔

کرمو کو موچیوں کے گھر کی لہسوڑی (گوندنی) سے بھی بڑی دلچسپی تھی حالانکہ یہ نہایت فضول قسم کا درخت سمجھا جاتا تھا اور اس کا پھل بے مزہ اور غلیظ۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ دارو کی ماں سے بیاہ کرنے سے پہلے کرمو کا موچیوں کے ہاں بہت آنا جانا تھا ان کی ایک لڑکی بھی لہسوڑی کی طرح اس سے چپکنا چاہتی تھی مگر گھر والوں نے اس کا کہیں اور بیاہ کر دیا۔ بڑے چودھری کے مربعوں میں بہنے والے کھالوں پر کرمو نے خوب شجر کاری کر رکھی تھی اور اب وہ دھریکوں، ٹاہلیوں اور شہتوتوں والے کھال کھلاتے تھے۔

اب باغ نہیں تھا مگر کہیں کہیں اس کے درخت چھوڑ دیئے گئے تھے وہ ان بچے کچے باغ کے درختوں اور گاؤں کے دوسرے درختوں کے سہارے زندگی کے باقی دن گزار سکتا تھا اس نے شہر جانے سے انکار کر دیا۔

وہ اس گھر کا جدی پشتی نمک خوار تھا اسے مجبور بھی کیا جاسکتا تھا مگر چھوٹے چودھری صاحب ایسا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ پھر پتہ نہیں یہ باغ سے جدائی کا نتیجہ تھا یا کام کی نوعیت اور ماحول کی تبدیلی کا اثر تھا کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ اور جان کے لالے پڑ گئے۔ اتفاق سے انہی دنوں چھوٹے چودھری صاحب اپنی جیب میں گاؤں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے موقع کو غنیمت جانا اور علاج کے بہانے باپ بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ تاہم انہوں نے تشفی دی کہ اگر ٹھیک ہونے کے بعد بھی ان لوگوں کا شہر میں جی نہ لگے تو وہ انہیں واپس گاؤں بھجوا دیں گے۔

ڈاکٹر علاج سے کرمو چند روز بعد ٹھیک ہو گیا تو چودھری صاحب اسے اپنے ساتھ سیر پر لے جانے لگے۔ وہ اسے باغوں، پارکوں، نرسریوں اور ایسی سڑکوں پر گھماتے جن کے دونوں جانب طرح طرح کے ملکی اور غیر ملکی اشجار کی قطاریں تھیں۔ انہوں نے کرمو کی کمزوری سے خوف فائدہ اٹھایا۔ کرمو نے نئے درخت اور پودے دیکھ کر خوش ہوتا مگر یہ خوشی ادھوری تھی۔ یہ خوبصورت درخت اسے اجنبی اور پرانے پرانے محسوس ہوتے جیسے وہ ان کی زبان نہ سمجھتے ہوں پھر بھی اسے توقع تھی کہ وہ جلد ہی ان سے دوستی پیدا کر لے گا۔ چودھری صاحب نے بارہا اسے ان پیڑوں سے باتیں کرتے اور ان کا حال احوال پوچھتے سنا اور خوب ہنسے۔ وہ خوش تھے کہ وہ شہر کے درختوں سے راہ ورسم بڑھارہا تھا۔

پھر وہ اسے روزگار ڈن میں پھولوں کی نمائش میں لے گئے جہاں ملک بھر سے طرح طرح کے پودے پھول اور جھاڑیاں (Shrubs) لاکر رکھی گئی تھیں۔ انہوں نے اسے مارگلہ اور مری کے جنگلات کی سیر بھی کرائی جہاں طرح طرح کے قدرتی اور لگائے گئے درخت اور پودے تھے اس نے بہت سے ایسے درخت پہلی بار دیکھے جن کے اس نے بزرگوں، سنیا سیوں اور مالیوں سے محض نام سن رکھے تھے یا جن کی طرف لکڑی یا پھل دیکھ رکھا تھا۔ دیودار پر اگر واقعی دیو اور جن رہتے تھے تو شاہ بلوط یقیناً پریوں کا مسکن ہوگا۔ کیل، اخروٹ، کہو اور سیب کے درخت دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اسے لگتا جیسے وہ درختوں کی جنت میں آ گیا ہے۔ چودھری صاحب کی کوٹھی میں باغبانی کا شوق پورا کرنے کی کافی گنجائش تھی۔ اس کا دل بہل گیا۔

ایسا نہیں تھا کہ اسلام آباد میں گھریلو ملازم نہ ملتے ہوں البتہ امیروں، وزیروں اور سفیروں کی وجہ سے ان کے معاوضے بہت بڑھ گئے تھے پھر کرمو اور دارو کی تو بات ہی دوسری تھی وہ غلام ابن غلام تھے۔ نہایت محنتی اور قابل اعتبار۔ ان کی وجہ سے چودھری فیملی کے بہت سے مسائل حل ہو گئے کرمو نے مالی اور چوکیدار کا کام سنبھال لیا اور دارو نے گھر کا سارا کام۔

چھوٹے چودھری صاحب نے بیگم کو سمجھا دیا تھا کہ وہ شروع شروع میں دارو پر کام کا زیادہ بوجھ نہ ڈالیں اور اسے اچھے کھانے اور ٹیلیویشن کی عادت ڈالیں۔ اور جس طرح خوراک اپنے مزدوروں کو چرس اور افیم کا عادی بنادیتے اور ٹھیکیدار اپنے راج مستریوں کو کھلے دل سے ایڈوانس دے کر قرضے کے جال میں جکڑے رکھتے ہیں اسی طرح چودھری فیملی نے کرمو اور دارو کو رہنے سہنے اور کھانے پینے کی سہولتوں اور چھوٹے موٹے احسانات کے پھندوں میں پھنسا لیا۔ اور منہ مانگا ایڈوانس دینے لگے۔ کرمو کو بیس سے زیادہ گنتی نہ آتی تھی۔ تنخواہ کے پیسے ہاتھ آئے تو گنتی بھی آگئی اور خرچ کے کئی راستے بھی نکل آئے۔ دارو کو اچھی بھلی اترن مل جاتی تھی پھر بھی اس کا دل سپر مارکیٹ اور باڑے کے چکر لگانے کو مچلتا رہتا۔ ہر مہینے نئے کپڑے، سینڈل گرگابیاں اور میک اپ کی چیزیں خریدی جانے لگیں۔ کوارٹر سے ٹرانسٹر کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ کچھ ہی عرصہ میں اس کے چہرے سے بیوگی اور بڑھتی عمر کی کھنگلی کے چھلکے اترنے لگے اور ان کی جگہ نئی کوئٹلیں پھونٹنے لگیں۔ آہستہ آہستہ چیزوں اور ضروریات کے مقابلے میں پیسے کم پڑنے لگے اور قرض کا چکر چلا۔ یوں گاؤں واپسی کا راستہ روز بروز دھول میں اٹکا چلا گیا۔

انہیں گھر میں ہر طرح کا آرام تھا۔ کوارٹر میں چھت کا پنکھا اور بجلی کا بلب لگا ہوا تھا ساتھ ہی غسل خانہ موجود تھا جاڑا ہو یا گرمی آندھی ہو یا بارش جب چاہو جتنی بار چاہو ہو آؤ۔ انہیں علیحدہ کھانا بھی نہیں پکانا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود کچھ ہی عرصہ بعد کرمو اس رہنے لگا۔ اسے گاؤں کی کٹیا کے مقابلے میں سارا باغ جس کا آنگن ہوا کرتا تھا یہ بند بند کوارٹر ایک بڑا پتھر محسوس ہونے لگا۔ اسے نہر

والا باغ یاد آتا جواب بھی جوں کا توں اس کے اندر آباد تھا۔

وہ وہیں باغ کے اندر ایک کنیا میں پیدا ہوا تھا۔ اور طرح طرح کے خوبصورت درختوں، پھولوں، پھلیوں، تیلیوں اور رنگا رنگ پرندوں کی چھبھاٹوں کے درمیان پلا بڑھا تھا۔ اسے اس باغ کے ایک ایک پیڑ کی صورت یاد تھی۔ اسے ان کی بور اور پھلوں سے لدی شاخیں، ہوا سے تالیاں بجاتے پتے اور گھنے سائے سب کچھ ازبر تھا۔ اسے وہ پرندے بھی یاد تھے جو راتوں کو باغ کے درختوں پر بسیرا کرتے اور دن کو کچے پکے پھل کتر کتر کر نیچے گراتے رہتے تھے اور جنہیں وہ ڈراتا دھمکاتا اور غلیل سے اڑانے کی کوشش کرتا رہتا تھا مگر وہ بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ اور وہ پرندے بھی جو باغ کی روشوں پر چل چل کر پنہوں سے طرح طرح کے نقش و نگار بنا دیتے۔ پانی کی کھالیوں اور آڈوں سے چونچیں بھر بھر کر پانی پیتے اور سیراب کیا ریوں میں بھیگ کر زور زور سے پروں کو پھڑ پھڑاتے۔ چڑیوں کوؤں تلیرؤں اور جنگلی کبوترؤں کی ڈاریں اترتیں اور اس کی پالتو بطنوں اور مرغیوں کے ہمراہ دانہ دنگا چگتی پھرتیں۔ اسے پرندوں کے نغموں سے معمور صبحیں اور شامیں بھی یاد تھیں اور وہ بھنورے اور شہد کی کھیاں بھی جو پھولوں کلیوں اور درختوں کے بور پر منڈلاتی اور خوشبو اور مٹھاس جمع کرتی رہتیں۔ اسے باغ کی ایک ایک چیز سے پیار تھا اسے تو وہ سانپ بھی اپنے رفیق معلوم ہوتے تھے جو باغ کے کسی نہ کسی گوشے میں اکثر نظر آتے تھے مگر انہوں نے کبھی اندھیرے یا اجالے میں اسے کوئی گزند نہیں پہنچایا تھا۔ بلکہ ایک طرح سے باغ کی رکھوالی کرتے رہتے تھے۔

کرم کو گپ شپ کی عادت تھی۔ نہر والا باغ گاؤں سے کافی فاصلے پر تھا اور بہت کم لوگوں کا وہاں آنا جانا ہوتا تھا مگر درخت اس کی زبان سمجھتے تھے وہ ان سے بات چیت کر لیتا تھا۔ اور اسے کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوتا تھا مگر یہاں درخت بھی اس کی زبان نہ سمجھتے تھے۔ ڈرائیور زیادہ تر گھر سے باہر رہتا اور باورچی اپنے کام میں مصروف۔ اڑوس پڑوس کے نوکر چاکر اپنے اپنے گھروں اور کوادرؤں سے باہر نہ نکلتے۔ چودھری صاحب سے تو کئی کئی روز ملاقات نہ ہو پاتی۔ وہ بے حد مصروف رہتے۔ صرف جمعہ کے روز تھوڑی دیر کے لئے کمرے سے باہر آتے اور پھولوں پودوں اور اس کے کام کا معائنہ کرتے، شاباش دیتے اور کبھی موڈ میں ہوتے تو گپ شپ بھی کر لیتے وہ انہیں گاؤں، نہر والے باغ کے درختوں اور اپنی زندگی کے جھوٹے سچے قصے سناتا۔ وہ اس کا دل رکھنے کی خاطر دلچسپی کا اظہار کرتے۔ اس کا کہنا تھا کہ درختوں میں بھی ایک طرح کی زندگی ہوتی ہے وہ بھی خوشی، غمی اور خوف محسوس کرتے ہیں۔ بعض زیادہ بعض قدرے کم۔ آدمیوں کی طرح ان میں بھی نرا اور مادہ ہوتے ہیں۔ پھل صرف مادہ درختوں کو لگتا ہے جس کے لئے ان کا اپنے ہم جنسوں سے تعلق اور ملاپ ضروری ہوتا ہے ورنہ وہ اچھل رہتے ہیں۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ درختوں کا جنسی ملاپ

پرندوں، بھنوروں، شہد کی مکھیوں اور ہوا کے ذریعے ہوتا ہے وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ درخت خوش اور ناراض ہو سکتے تھے اور ایک خاص حد تک اپنی خدمت کرنے یا نقصان پہنچانے والے ہاتھوں کو پہچانتے تھے۔ ایک روز کہنے لگا۔

”یہ ان دنوں کی بات ہے چودھری صاحب جب ابھی دارو کی ماں سے میرا بیہوش ہوا تھا۔ وہ دوپہر کو اکثر نہر پر کپڑے دھونے آتی اور مجھے غافل پا کر پھل چرا کر بھاگ جاتی۔ میں گیلی کیاریوں اور روشوں کی دھول پر لگے اس کے قدموں کے نشانات سے کھوج لگاتا اس تک پہنچ جاتا مگر وہ بچا کچھا پھل اور گٹھلیاں پانی میں پھینک دیتی اور اس سے کچھ برآمد نہ ہو سکتا۔ بعض اوقات اس کے ہونٹ جامنیں کھانے کی چغلی کھا رہے ہوتے مگر وہ صاف مکر جاتی اور مجھے چڑاتی رہتی۔ میری کوشش رہتی کہ اسے کسی روز رنگے ہاتھوں پکڑوں اور اسے ہر اس کی بات اس سے کروں مگر وہ اس کا موقع نہ دیتی تھی۔ لیکن پھر ایک روز جب میں دوپہر کو وہیں ایک جامن کے پیڑ کے قریب سو رہا تھا۔ ایک جامن بڑے زور سے میرے ماتھے پر لگی اور عین موقع پر میری آنکھ کھل گئی۔ میں سمجھ گیا کہ جامن کے پیڑ نے مجھے عین وقت پر جگا دیا ہے۔“

”واقعی بڑا ذہین اور فرمانبردار درخت تھا۔“ چودھری نے ہنستے ہوئے کہا۔

”سارے درخت ایسے ہی تھے۔ چودھری صاحب میں جو کہہ دیتا کبھی نہ ٹالتے، میرے دل کی بات جان لیتے۔“

کرم کو جب بھی موقع ملتا وہ اس قسم کی گفتگو کرنے لگتا۔ چودھری صاحب کو علم تھا اسے گپ ہانکنے کی عادت ہے اور وہ دارو کی مرحومہ ماں کو یاد کرنے کا بھی کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتا ہے۔

کوشی میں کرم سے پہلے بھی ایک پارٹ ٹائم مالی کام کرتا تھا اور گھر میں بہت سے درخت پھول اور پودے تھے مگر کرم کے آنے سے کچھ ہی عرصہ میں سارا گھر گل و گلزار بن گیا۔ گھر کے عقبی حصے میں آم کا ایک پیڑ تھا جسے بہت کم پھل لگتا تھا۔ ایک روز کرم نے کہا۔

”چودھری صاحب اس بار آم کا یہ پیڑ بہت پھل دے گا۔“

”وہ کیسے؟“ بیگم نے پوچھا۔

”میں نے اس کی بہت خدمت کی ہے۔ آپ کو یاد ہے قربانی کے بکروں کا خون بھی اس کی جڑوں میں ڈالا تھا اور اب میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر وہ پھل نہیں دے گا تو اسے کاٹ دیا جائے گا۔“

”آم کے پیڑ نے کیا جواب دیا ہے۔“ چودھری نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”رت آنے دیجئے پھر دیکھئے کیا جواب دیتا ہے۔“ کرم نے وثوق سے کہا اور جب پھل لگنے کا موسم آیا تو چودھری اور ان کی بیگم

بید دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سچ مچ اس برس آم کے پیڑ کو اس قدر پھل لگا کہ پچھلے سات برسوں میں کبھی نہیں لگا تھا۔ کرمو بہت خوش تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اس دھمکی کا نتیجہ تھا جو اس نے آم کے پیڑ کو دی تھی مگر پڑھے لکھے چودھری صاحب اس کی باتوں پر کیسے یقین کر لیتے اگرچہ انہیں اس کا کوئی دوسرا سبب بھی معلوم نہ تھا۔ بیگم پہلے ہی اسے خبطی سمجھتی تھیں اب انہیں یقین ہو گیا کہ کسی روز اس کا دماغ بالکل ہی چل جائے گا اور وہ آدمی اور درخت میں تمیز کرنے سے قاصر ہو جائے گا۔

دارو اب مکمل طور پر شہری رہن سہن اور آسائشوں کی عادی ہو گئی تھی اس کی عادات و اطوار بھی بدل گئی تھیں مگر کرمو ویسے کا ویسا گنوار تھا اس پر شہر کی زندگی نے کچھ بھی اثر نہ ڈالا تھا۔ شہر کے مخصوص کھانے اسے کچھ مزہ نہ دیتے۔ چٹنی اچار اور پیاز سے روٹی کھا لیتا چائے پینے سے اسے گرمی لگنے لگتی۔ اسے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی کچھ زیادہ دلچسپی پیدا نہ ہوئی۔ وہ ذہنی طور پر اپنے نہروالے باغ میں رہتا جو اس کے ذہن کے سوا اب کہیں موجود نہ تھا۔ وہ خوابوں میں گاؤں کے درختوں سے باتیں کرتا۔ ان کے دکھ سکھ اور شکوے شکایتیں سنتا۔ کبھی بوڑھے برگد کی پکار سن کر جاگ پڑتا کبھی پھر وانہ کی سسکاریاں سن کر خواب میں رونے لگتا۔

پھر ایک اس نے ایک نہایت بری خبر سنی۔ چودھری صاحب کوٹھی کے عقبی حصے میں توسیع کا ارادہ رکھتے تھے اور اس کے لئے نقشہ بنوا رہے تھے۔ انکی تعمیر کرنے کا مشورہ انہیں ان کے ایک ٹھیکیدار دوست نے دیا تھا جس کا کہنا تھا کہ اتنی ساری جگہ محض پھول پودوں کے لئے چھوڑ دینا کہاں کی دانشمندی تھی جب کہ انکی تعمیر سے ہر ماہ اچھا خاصا کرایہ حاصل ہو سکتا تھا۔ کرمو کو وہ چھوٹا سا باغیچہ بھی جو اس نے دن رات کی محنت سے آباد کیا تھا، اجڑنا نظر آیا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے احتجاج کرنا چاہا مگر اس کی حیثیت کیا تھی۔ اس بار بھی اس کی ایک نہ سنی گئی اور نقشہ پاس ہوتے ہی آڑ وٹا شپاتی، لوکاٹ اور خوبانی کے پیڑ کاٹ دیئے گئے۔ گلاب، موتیا اور دوسرے رنگارنگ پھول اور پودے اینٹوں اور ریت بجری کے ڈھیروں تلے دب گئے۔ کرمو کا جی چاہا وہاں سے بھاگ جائے مگر دارو کی صورت اس کے پاؤں میں زنجیر پڑی تھی۔ چودھری صاحب بھی اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ انہیں کام میں مدد اور نگرانی کے لئے اس کی اب پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت تھی۔

کھدائی کرنے سے پتہ چلا کہ آم کا پیڑ بھی کاٹنا پڑے گا ورنہ اس کی جڑیں بنیادوں کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ ویسے بھی آندھی یا طوفان کی وجہ سے اس کے ٹوٹنے سے نئی عمارت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اسے جڑوں سمیت نکالنا ضروری سمجھا گیا اور یہ کام کرمو کے ذمہ لگا دیا گیا۔ کرمو کو ایسا لگا جیسے اسے کسی عزیز کو قتل کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اس نے پہلے تو انکار کر دیا مگر جب چودھری صاحب بگڑ گئے تو اسے نہ چاہتے ہوئے بھی حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

اگلے روز کام بند تھا۔ درخت نکل جاتا تو ایک ساتھ ساری بنیادوں میں روڑی ڈالی جاتی۔ کرمونے صبح ہوتے ہی کلہاڑا لے کر درخت کا ثنا شروع کر دیا۔ یہ وہی درخت تھا جس کی جڑوں میں وہ قربانی کے بکروں کا خون ڈالتا رہا تھا اور جس نے اس کی دھمکی سن کر اپنا وطیرہ بدل لیا تھا۔

چودھری صاحب اور گھروالے ٹیلیویشن پر صبح کی نشریات دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور گاڑی صاف کر رہا تھا اور دارو باورچی کے ساتھ مل کر ناشتہ تیار کر رہی تھی کہ اچانک درخت کے ٹوٹ کر گرنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی کرمو کی ایسی چنگھاڑ جس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ چیخ تھا یا نعرہ سب لوگ دوڑتے ہوئے پہنچے کیا دیکھتے ہیں کہ درخت گرا پڑا ہے اور خون میں لت پت کرمو اس کے نیچے دبا ہوا ہے۔

وہ لوگ جو اسے قریب سے جانتے تھے اور وہاں موجود تھے شروع میں اسے ایک اتفاقی حادثہ ہی سمجھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شکوک و شبہات پیدا ہوتے چلے گئے اور یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ اس کی آخری آواز چیخ تھی یا نعرہ۔ پھر جب اس کی ذہنی کیفیت اور باتوں پر غور شروع ہوا تو مزید الجھنیں پیدا ہوتی گئیں اور آج تک وہ کسی ایک نتیجے پر متفق نہیں ہو سکے۔

